سندھ کی ترقی

خواب سے حقیقت کا سفر

نصیر میمن

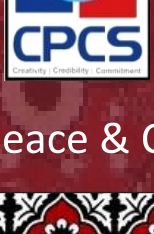

Center for Peace & Civil Society

All Rights Reserved

53

Book Title: **Sindh Ki Taraquee - Khoab Say Haqiqat Ka Safar**

Subject: **Politics and Development**

Author: **Naseer Memon** (nmemon2004@yahoo.com)

Year: **October 2014**

Published by : **Center for Peace & Civil Society (CPCS)**

Price: **Rs. 250/-**

Books are available at:

Mr. Books Islamabad
Saeed Book Shop Islamabad
Feroze Sons Mall Road, Lahore
Thomas & Thomas Book House Karachi
Kathyawar Book House Karachi
Sindhica Kitab Ghar Hyderabad
Fiction House Hyderabad
Rabel Kitab Ghar Larkano
Gul Kitab Ghar Shikarpur
Junaid Kitab Ghar Dadu
Sindhica Kitab Ghar Sukkur
Marvi Kitab Ghar Tando Allahyar
Mehran Kitab Ghar Mirpur Khas
Hillal Kitab Ghar Mirpur Khas

سندھ کی ترقی

خواب سے حقیقت کا سفر

نصیر میمن

انتساب.....!

سندھ کی ان شہید بیٹیوں کے نام جن
کو وحشی مرد غیرت کے نام پر کاری قرار
دے کر قتل کرتے ھیں

فہرست

مصنف کے قلم سے 7

سندھ کی ترقی، جاگیردارانہ شکنجے میں ۔۔۔ 11

سیاسی اور معاشی میدان میں پسماندہ رکھا جانے والا سندھ 18

ذوالفقار آباد۔ سندھیوں کیلئے نیا طوق 27

سندھ کو درپیش مسائل 35

سندھ کی تقسیم کی خواہش اور زمینی حقائق 40

ذوالفقار آباد۔ اشرافیہ کے لیے اشرافیہ کا منصوبہ 46

سندھیوں کی گردن میں پڑنے والا نیا طوق 53

سرد جنگ کے نئے دور میں کراچی کی اہمیت 59

ہندوؤں کی نقل مقانی: سازش، پروپیگنڈا اور حقیقتیں 66

خوشحالی کے جزیرے 72

ضد پر اڑے حکمرانوں کو عوام کا پیغام آخر کب سمجھ میں آئے گا؟ 77

مشرقی پاکستان کیوں علیحدہ ہوا؟ 84

مذہب اور ریاست کا تعلق اور معاشرہ 89

انتہا پسندی کی بھول بھلیاں 96

پیپلز پارٹی کی سیاسی تاریخ کا تجزیہ 101
سندھی زبان کے تحفظ کی جدوجہد 115
بیسویں ترمیم کابل اور سندھ کے تحفظات 121
دہرے بلدیاتی نظام کا اور کیا ثبوت چاہیئے 127
نچلے درجے کے شہریوں کے لیے قانون 135

مصنف کے قلم سے

سندھ جو کسی زمانے میں خوشحالی اور ترقی کی علامت ہوتا تھا، آج خراب حکمرانی، کرپشن، بدامنی، اور، سماجی انحماد کا شکار ہے۔ وفاق کے محافظوں کی غلط پالیسیوں اور سندھیوں کے ووٹ سے منتخب ہوکر مسلسل ایوان اقتدار میں رہنے والے کرپٹ اور عوام دشمن حکمرانوں نے مل کر سندھ کی ترقی کو ایک خواب بنا دیا ہے۔

یوں تو پاکستان بننے کے بعد لگا تار سندھ کے وسائل کی لوٹ کھسوٹ کی گئی۔ زمینوں، تیل اور گیس اور پانی سمیت سندھ کے وسائل پر دن دیہاڑے ڈاکے ڈالے گئے لیکن جو بات ان سے بھی زیادہ خطرناک ہے وہ سندھ کے استحصال اور بربادی میں برابر کے شریک وہیں کی اپنی سیاسی قیادت ہے۔ سارے ملک میں عمومی طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ پیپلز پارٹی سندھیوں کی جماعت ہے اور اس کی حکومت بننے سے سندھ میں دودھ اور شہد کی ندیاں بہنے لگتی ہیں۔ ایک عرصے تک سندھیوں کو بھی یہ خوش فہمی رہی ہے کہ پیپلز پارٹی ان کے اجتماعی مفادات کی محافظ پارٹی ہے۔ 80ء اور 90ء کی دہائیوں میں سندھ نے پیپلز پارٹی کی غلطیوں کو اس لیے نظر انداز کیا کیوں کہ ان برسوں میں پیپلز پارٹی کی حکومت پر دو مرتبہ شب خون مارا گیا۔ یوں پیپلز پارٹی ایک مظلوم پارٹی کی حیثیت میں اپنے تمام تر غلط اعمال کے باوجود سندھیوں کی مقبول جماعت رہی۔ تاہم 2008ء سے 2013ء تک سندھ پر حکمرانی کرنے والی

آصف زرداری کی پیپلز پارٹی کے بارے میں سندھ کے اندر مختلف خیال پائے جاتے ہیں۔ 2013ء کے انتخابات میں ویسے تو پیپلز پارٹی کو سندھ میں کامیابی حاصل ہوئی لیکن اس کی کامیابی کی وجہ اس کی گذشتہ برسوں کی کارکردگی نہیں بلکہ کسی مظبوط اور قابل بھروسہ متبادل سیاسی طاقت کی عدم موجودگی تھی۔ پیپلز پارٹی کے کئی اہم رہنماؤں کو گذشتہ انتخابات کے مقابلے میں کم ووٹ حاصل ہوئے اور حلقوں میں پیپلز پارٹی کے مخالفوں نے نمایاں طور پر زیادہ ووٹ حاصل کیے۔ گزشتہ پانچ برسوں کے دوران پیپلز پارٹی نے دوسرے بلدیاتی نظام، ذوالفقار آباد کے منصوبے نے انتہا کرپشن اور میرٹ کی دھجیاں اڑا کر سندھیوں کو شدید مایوس کیا۔ دوسرے بلدیاتی نظام کو اگر انتخابات سے قبل واپس نہ لیا جاتا تو شاید پیپلز پارٹی کے امیدواروں کے لیے سندھ میں انتخابی مہم چلانا مشکل ہو جاتا۔ پیپلز پارٹی نے سندھ کے اندر ہر محکمے میں میرٹ کو بالائے طاق رکھ کر جس طرح بڑے پیمانے پر تقرریاں، تبادلے اور ترقیاں کیں اور جس طرح اس کالے کاروبار میں اربوں روپے لوٹے گئے، اس سے سندھ کے باشندوں کو شدید مایوسی ہوئی۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ پیپلز پاٹی کے ووٹرز متبادل سیاسی قیادت اور پارٹی کی خواہش کا اظہار کرتے رہے۔ سندھ کے عام باشندوں نے بھلے الفاظ میں پیپلز پارٹی سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔ بدقسمتی سے پیر پگاڑہ کی قیادت میں بننے والے اتحاد نے کوئی منظم انتخابی مہم نہ چلا کر پیپلز پارٹی کو کھلا میدان فراہم کیا۔ کچھ حلقوں کا خیال ہے کہ پیر پگاڑہ نے عین وقت پر پیچھے ہٹ کر قوم پرست پارٹیوں کے اتحاد میں بھی دراڑیں ڈال دیں اور سندھ میں ابھرتی ہوئی ایک مظبوط متبادل قوت کا بھی گلا گھونٹ دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید اس بار انتخابات کا منظر نامہ کچھ مختلف ہوتا۔ انتخابات کی سیاست کے اپنے عوامل ہوتے ہیں۔ نتائج سے قطع نظر ایک بات واضح ہو چکی ہے کہ سندھ کے باشندے اب پیپلز پارٹی سے پہلے والا والہانہ جذباتی لگاؤ نہیں رکھتے اور سندھ میں ایک صحت مند سیاسی متبادل کی عدم موجودگی کا پیپلز پارٹی کو فائدہ حاصل ہو رہا ہے لیکن اب شاید یہ کھیل لمبے عرصے تک جاری نہ رہ سکے۔ اب شہیدوں کے واسطوں اور مزاروں کی عقیدت کے بجائے سندھ کے لوگ جمہوریت کا حقیقی ثمر چاہتی ہیں۔ بظاہر تو اس وقت پیپلز پارٹی کو کوئی بہت بڑا چیلنج درپیش نہیں

ہے کیوں کہ سیاہ وسفید کے مالک ہونے کی وجہ سے ان کے پاس سیاسی انتظامات اور ہر طرح کی طاقت موجود ہے۔لیکن سندھ میں اس اجارہ داری کو لمبے عرصے تک قائم رکھنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔

اس وقت سندھ ترقی کے حوالے سے ایک بدترین صورت حال کا سامنا کر رہا ہے۔تعلیم کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔صحت کے حوالے سے بھی صورت حال انتہائی خراب ہے۔اکثر شہروں اور قصبوں کی سڑکوں میں فراہمی ونکاسی آب کی صورت حال مخدوش ہے۔ دیہات میں پانی پر جاگیرداروں کا قبضہ ہونے کی وجہ سے غریب طبقات زراعت کے ثمر سے بھی محروم ہیں۔سرکاری اداروں میں بدعنوانی اور بدانتظامی کی وجہ سے لوگوں کو نظام حکومت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور وہ پیپلز پارٹی کے وڈیروں کے رحم وکرم پر ہیں۔پیپلز پارٹی کی ناعقبت اندیش قیادت نے ابھرتے ہوئے سندھی متوسط طبقے کو ترقی کا مرکز بنانے کے پیمانے دور جہالت کے سماجی ڈھانچے کو تقویت بخشی ہے۔یوں سندھ میں دم توڑتی ہوئی وڈیرا شاہی کو پیپلز پارٹی نے نیا خون عطا کیا ہوا ہے۔نہ صرف وڈیرے بلکہ پیپلز پارٹی کی کرپشن کی بہتی ہوئی گنگا میں نہا کر متوسط طبقے کی اشرافیہ کی کئی ہونہار اب وڈیروں سے زیادہ ابن الوقت ،موقع پرست اور کرپٹ ہو چکے ہیں۔اب صرف وفاق کا انتظامی ڈھانچہ یہ ہی نہیں بلکہ سندھیوں کی محبوب پارٹی بذات خود ان کی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن کر ابھری ہے۔ اندرونی طاقتیں جس سماج کی بربادی کی ٹھان لیں تو بیرونی طاقتوں کا کام آسان ہو جاتا ہے ۔پیپلز پارٹی کی اس روش کی جدوجہد سے سندھی سماج کو نا قابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے اور سندھیوں کے قومی مفادات کو شدید زک پہنچ رہی ہے۔جس قوم کے ہزاروں اسکول بند ہوں اور اساتذہ علم کے مینار ہونے کی بجائے جہالت کا جہان بن جائیں اکیسویں صدی میں اس قوم کو ختم کرنے کے لیے توپوں اور بندوقوں کی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔اس کتاب میں شامل مضامین میں اس نوعیت کے معاملات پر بحث کی گئی ہے۔ یہ مضامین وقتاً فوقتاً سندھی اخبارات وجرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں جن کو جمع کر کے یہ کتاب تشکیل دی گئی ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب سندھ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کو سندھ کے سیاسی و سماجی صورت حال کے بارے میں کچھ مفید معلومات فراہم کرے گا۔

نصیر میمن

اسلام آباد

سندھ کی ترقی، جاگیردارانہ شکنجے میں۔۔۔

اکیسویں صدی میں قدم رکھنے والے سندھ کے مستقبل کیلئے سب سے بڑا چیلنج اس کو غلام بنانے والا ریاستی ڈھانچہ ہی نہیں بلکہ اُس کی اتحادی وہ جاگیردارانہ قوتیں بھی ہیں جنہوں نے سندھ میں تبدیلی کے راستے پر ہزاروں رکاوٹیں کھڑی کر رکھیں ہیں۔ سندھ جب تک اندرونی طور پر غلام بنائے رکھنے والے جاگیردارانہ معاشرتی نظام کے شکنجے کو نہیں توڑے گا تب تک وہ ریاستی جبر کا مقابلہ نہیں کر پائے گا۔ درحقیقت سندھ کو داخلی طور پر غلام بنانے والا جاگیردارانہ ڈھانچہ اس ریاستی مشینری کا فطری اتحادی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے اس ایجنڈے کو تقویت بخشتے ہیں کہ سندھی قوم کی نمو کو ہر پہلو سے روکا جائے تاکہ وہ اپنے اجتماعی مفادات کے تحفظ کیلئے کوئی بھی معنیٰ خیز کوشش نہ کر پائے۔

1980ء کی دہائی سندھ کی ماضی قریب کی تاریخ کی اہم ترین دہائی ہے, اس دہائی میں سندھ کے عوام نے ریاستی مشینری اور جاگیردارانہ معاشرتی ڈھانچے دونوں کے خلاف یادگار بغاوتیں کیں۔ 1983ء کی ایم آر ڈی کی تحریک کے ذریعے سندھی عوام نے ریاستی جبر و استبداد کے خلاف شاندار سیاسی مزاحمت کی اور 5 سال بعد 1988ء میں، ووٹ کی طاقت کے ذریعے ریاستی مشینری کے اتحادی جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے جاگیرداریت کے بڑے بڑے بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ ان دونوں قابل فخر فتوحات کو ملک کے مقتدر حلقوں کی جانب سے نظر انداز کیا جانا ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ کے ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کو کچلنے کی منظم

منصوبہ بندی کی گئی۔ تمام تر مصلحتوں اور مفاد پرستیوں کے باوجود متوسط طبقے میں سندھ کے معاشرتی ڈھانچے کو تبدیل کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ 80 اور 90 کی دہائیوں میں سندھ کے اندر ڈاکو کلچر اور دہشت گردی کو منظم انداز میں فروغ دینے اور سندھ کی پرائمری اور اعلیٰ تعلیم کو برباد کرنے کا آغاز کیا گیا۔ پرائمری اسکولوں میں سفارشی اساتذہ کی بھرتیاں اور یونیورسٹیوں میں اسلحہ کی کھلی آزادی دی گئی۔ ڈاکو گردی، تعلیم کی تباہی اور سفارشی بھرتیاں سندھ کے ابھرتے ہوئے متوسط طبقہ کی ترقی کو چاروں شانے چت کرنے کا پیکج تھا۔ جس میں ریاستی ڈھانچے اور جاگیرداروں کا مشترکہ مفاد شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 88ء کے عام انتخابات میں عوام کے رد کردہ جاگیردار طبقہ کو آنے والے برسوں میں مکمل ریاستی سرپرستی کے ساتھ عوام پر مسلط کیا گیا۔ اس مقصد کے تحت ناظمی نظام، ملازمتوں کے کوٹہ، تھانوں پر قبضے، اسمبلی ارکان کو ترقیاتی فنڈز کا مالک بنانے جیسے طریقے عام کر کے اس طبقے کو ریاستی وسائل کا قانونی مالک بنایا گیا تاکہ وہ معاشرتی نمو کی ہر راہ پر اپنا تسلط قائم کر کے عوام کو اپنا غلام بنائے رکھیں۔ تھانے، ملازمتیں، تبدیلیاں اور ٹھیکے سب جاگیرداروں کے ماتحت بنا کر انگریز دور کے اس استعماری نظام کا اعادہ کیا گیا جس میں جاگیردار ریاست کے اور عوام ان کے غلام بنے ہوئے تھے۔ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود گزشتہ دو دہائیوں کے دوران سندھ کے متوسط طبقہ نے اہم پیش رفت کی تھی، سول سوسائٹی کے مختلف اداروں جیسا کہ میڈیا اور این جی اوز سے لیکر چھوٹے اور متوسط شہری تجارتی مواقع میں قدم جماتے ہوئے سندھ کے متوسط طبقے کی اس نسل نے معاشرے میں اپنا مقام بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ دیہی علاقوں میں بدامنی اور معاشی تنزلی کے باعث 80 اور 90 کی دہائیوں میں جن سندھیوں نے شہروں کی طرف نقل مکانی کی ان کی موجودہ نسل روایتی سندھی نوجوان سے بہت مختلف ہے۔ قومی دھارے کے میڈیا سے لے کر بینکاری و انشورنس جیسے شہری معیشت کے شعبوں میں اپنی جگہ بنانے والے اس ابھرتے ہوئے متوسط شہری طبقے کو کوئی بھی سیاسی معاونت حاصل نہیں۔ قوم پرست جماعتیں اپنی غلط حکمت عملیوں کے باعث خود کو اس طبقے کی نمائندہ نہ بنا سکیں اور ان کے ووٹ پر اقتدار حاصل کرنے والی پیپلز پارٹی نے عوام دشمن جاگیردار طبقے اور اسی کا حصہ بننے کیلئے کوشاں کرپٹ متوسط طبقہ کے ہاتھوں یرغمال بن کر سندھی سماج میں تبدیلیوں کے فروغ کے

بجائے خود ریاستی ڈھانچے کا اتحادی بن کر سندھیوں کو سفارشی ملازمتوں، ٹھیکوں، تبادلوں، تقرریوں اور خیراتی پروگراموں کے لولی پاپ دے کر ان کے اعتماد کو توڑا۔ 2008ء میں سندھیوں کے ووٹ سے اقتدار میں آنے والی پیپلز پارٹی کے پاس ایک تاریخی موقع تھا کہ وہ 1996ء میں آخری حکومت گوانے کے بعد سندھ میں قدم جمانے والے نئے سوچ کے حامل متوسط طبقہ کی سیاسی سرپرستی کر کے ایک نئے سندھ کی بنیاد رکھے، وہی کام جو ذوالفقار علی بھٹو نے 70 کی دہائی میں سندھ کو متوسط طبقہ کی پہلی نسل فراہم کر کے کیا تھا، چار دہائیوں کے بعد پیپلز پارٹی اسے تاریخ کے نئے موڑ پر لا سکتی تھی لیکن معاشرتی تبدیلیوں کی قومی تاریخ میں بنیادی اہمیت سے لاتعلق پیپلز پارٹی نے اس تاریخی موقع کو بیدردی سے ضایع کرتے ہوئے سندھ سے بدترین زیادتی کی۔

2010 اور 2011ء میں سیلاب کی تباہی نے سندھ میں معاشرتی تبدیلی کو فروغ دینے کیلئے دو اہم قدرتی مواقع فراہم کیے، ان دو برسوں کے دوران سیلاب کے نتیجے میں بے گھر ہونے والے سندھی لاکھوں کی تعداد میں دیہات سے نکل کر شہروں کی طرف جانے پر مجبور ہوئے تھے، انہیں عمومی نوعیت کی حکومتی سرپرستی سے شہروں میں زمین اور روزگار کے مواقع فراہم کر کے نہ صرف لاکھوں انسانوں کو شہری ماحول سے جوڑتے ہوئے بدبودار جاگیردارانہ غلامی سے نجات دلائی جا سکتی تھی بلکہ سندھ کے شہروں میں آبادی کے توازن کو سندھیوں کے حق میں کسی حد تک بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ یہ تبدیلی نہ صرف پیپلز پارٹی کے شہری اتحادیوں کو قبول نہ تھی بلکہ پارٹی پر قابض وڈیروں کیلئے بھی ناقابل قبول تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرضوں کے بوجھ اور جاگیردارانہ غلامی سے بیزار ان لاکھوں لوگوں کو زبردستی واپس لوٹا کر دوبارہ جاگیردارنہ عفریت کے سامنے ڈال دیا گیا۔ سیلاب متاثرین کی کیمپوں میں امدادی کاموں میں حصہ لینے والے بخوبی جانتے ہیں کہ شہری علاقوں میں پہنچے ہوئے یہ لوگ گاؤں کی طرف جانے کے لیے رضامند نہیں۔ ان کی بڑی اکثریت شہروں میں رہائش اور روزگار کے مواقع حاصل کرنے کیلئے بے چین تھی۔ ان سیلاب متاثرین کو دیہات میں غلامی کی طرف واپس دھکیلنے کیلئے دو کام کیے گئے۔ ایک تو حکومت سے یہ فیصلہ کروایا گیا کہ وطن کارڈ پے ملنے والی مالی معاونت کا اجراء صرف انہیں اضلاع کے بینکوں سے مشروط کر دیا گیا

جہاں سے نقل مکانی کرنے والے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدا میں نادرا کی جانب سے وطن کارڈ کے ذریعے کسی بھی بنک سے رقم کے اجراء کی سہولت دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا جسے سرکاری وڈیروں کے مطالبے پر حکومت نے تبدیل کیا، اس فیصلے کے ساتھ سیلاب زدگان کو اس امید سے باندھ دیا گیا کہ اپنے اضلاع میں واپس آ کر 20 ہزار روپے کی پہلی قسط لے لیں اور 80 ہزار کی دوسری قسط جلد مل جائے گی۔ حکومت جانتی تھی کہ 80 ہزار کی دوسری قسط دینے کیلئے رقم ہے ہی نہیں لیکن لوگوں کو وڈیروں کی غلامی میں دھکیلنا تھا اس لیے ایک لاکھ روپیہ فی گھرانہ کا آسرا دے کر لوگوں کو اپنے آبائی اضلاع میں واپس لوٹانے کا سوانگ رچایا گیا۔ اس امر کو یقینی بنانے کیلئے وڈیروں کی فرمائش پر دوسرا کام یہ کیا گیا کہ سیلاب سے متاثرہ علاقوں سے ابھی پانی خشک بھی نہ ہوا تھا کہ سرکاری اور غیر سرکاری کیمپوں میں لوگوں کو اشیاء خوردونوش کی فراہمی کا سلسلہ بند کروایا گیا۔ لاکھوں بے یار مددگار لوگوں کو خالی ہاتھوں کیمپوں سے بے دخل کر دیا گیا تا کہ وہ مجبور ہو کر وڈیروں کی شکارگاہوں کی طرف لوٹ جائیں۔ غیر سرکاری تنظیموں کے متعدد کیمپوں کو سرکاری مشینری کے ذریعے یہ کہہ کر خالی کروایا گیا کہ ریلیف کا مرحلہ ختم ہو چکا ہے اور اب حکومت متاثرین کو زمین کی کاشت کیلئے بیج اور کھاد کے ساتھ ساتھ مکانات کی تعمیر کیلئے بھی معاونت فراہم کر رہی ہے، ان لوگوں کو تعمیر اور بحالی کے عمل کا حصہ بننے کے لیے واپس بھیجا جائے۔ چند ہفتوں میں ہی یہ امر آشکار ہو گیا کہ کسانوں کو زمین کی بحالی، بیج اور کھاد کی کتنی سہولت ملی جبکہ وطن کارڈ کی دوسری قسط کا اجراء بھی نہیں ہو سکا۔ اس شعبدہ بازی کے ذریعے چالاک وڈیروں نے حکومتی مشینری اور وسائل کو استعمال کیا اور لوگوں کو شہروں میں آباد ہو کر سندھ کی معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلی کی لہر پیدا کرنے کا محرک بننے کے بجائے اپنے علاقوں کی طرف ہنکایا، جہاں انہیں اپنی شہنشاہت برقرار رکھنے کیلئے ہر وقت لاکھوں غلاموں کی ضرورت رہتی ہے، انہی لوگوں کے ووٹ کے ذریعے یہ وڈیرے اقتداری ایوانوں میں پہنچتے ہیں۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ ان لاکھوں ووٹوں کی قربانی دیں اور لاکھوں انسانوں کو اپنی غلامی کی زنجیریں توڑتے ہوئے شہروں کے نسبتاً باعزت معاشرے کا حصہ بننے دیں۔ اگر کسی طرح یہ ہزاروں سندھی خاندان شہروں میں آباد ہو جاتے تو چند برسوں میں سندھ میں شہری متوسط طبقے کی ایک دوسری بڑی نسل جنم لیتی جو سندھی معاشرے کی بنیادوں کو تبدیل کرنے

میں غیر معمولی کردار ادا کر سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جاگیردار طبقے نے اسے ناممکن بنا دیا۔ اس طرح حکومت نے وڈیروں اور شہری اتحادیوں دونوں کو خوش کر دیا۔

حکومت پر قابض اس جاگیردار طبقے نے سندھ میں معاشرتی تبدیلی کے عمل کو روکنے کیلئے تین اور کام کیے۔ سندھ کے دیہی علاقوں کیلئے تمام تر اعلانات اور وعدوں کے باوجود مرکزی روڈ نیٹ ورک کو توسیع دینے کے بجائے دیہی علاقوں کو دیہی علاقوں سے منسلک کرنے کیلئے رابطہ سڑکوں کو ترجیح دی گئی۔ لنک روڈ بھی اہم سہولت ہیں اور ضرور ہونے چاہییں، تاہم بڑے روڈ نیٹ ورک کے ذریعے دیہی کو شہری علاقوں سے منسلک کرنے کے بجائے رابطہ سڑکوں کے ذریعے گاؤں کو گاؤں سے جوڑنے کا مقصد شہری اور دیہی علاقوں کے درمیان رابطوں میں تیزی کے عمل کو روکنا تھا۔ اس دلیل کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ گاؤں کو گاؤں سے یا چھوٹے قصبوں سے منسلک نہ کیا جائے یہ عمل بھی نہایت ضروری ہے۔ معاشرتی تبدیلی کیلئے اس سے بھی زیادہ اہم سرمایہ کاری گاؤں کو شہروں سے جوڑنے والے اہم روڈ نیٹ ورک پر کرنے کی ضرورت ہے۔ بڑی سڑکوں کا جال بچھانے سے جب دیہی علاقے شہروں سے منسلک ہوں گے تو نہ صرف دیہی معیشت میں شہری رنگ اپنا اثر چھوڑے گا بلکہ دیہی اور شہری آبادی کے روابط سے ان کی سیاسی سوچ کی بنیاد بھی تبدیل ہوگی۔ گزشتہ چار برسوں کے دوران سندھ میں نیشنل ہائی وی، انڈس ہائی وی اور سپر ہائی وی کی اصلاح کیلئے کوئی نمایاں پیش رفت نہیں کی گئی، اسی طرح کراچی اور حیدرآباد کو باقی سندھ سے منسلک کرنے کیلئے کسی بھی بڑی شاہراہ کی تعمیر کے منصوبہ پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔

2010ء کی بارشوں اور سیلاب کے بعد دریائے سندھ کے دائیں کنارے کے تمام روڈ تباہ ہو چکے تھے، انڈس ہائی وی جو سیہون سے سکھر تک پہلے ہی سفر کے قابل نہ تھا، اس کے بڑے حصے میں گڑھے پڑ چکے تھے اس کو بہتر بنانے اور دورویہ کرنے کے اعلان پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ انڈس ہائی وی کی خستہ حالی کے بعد ٹریفک کا تمام بوجھ نیشنل ہائی وی کی طرف منتقل ہو گیا جس کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں دورویہ بنائی گئی اس اہم شاہراہ کی حالت بھی ابتر ہو چکی ہے۔

کراچی اور حیدر آباد کو منسلک کرنے والے سپر ہائی وے کو کاغذوں میں تو موٹر وے کا درجہ مل گیا ہے تاہم اس کی حالت ابھی رابطہ سڑکوں جیسی ہی ہے۔ تھر میں گزشتہ حکومت کی جانب سے تعمیر کردہ بہتر معیار کی سڑکوں کو بارشوں سے بہت زیادہ نقصان پہنچا ان کی بہتری کیلئے بھی کچھ نہ کیا گیا۔ نیشنل ہائی وے پنجاب سے جیسے ہی سندھ میں داخل ہوتا ہے تو اس کی حالت نیم پختہ سڑک سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ چار برسوں کے دوران اس کی بہتری کیلئے کچھ بھی نہیں کیا گیا اور تمام توجہ رابطہ سڑکوں کے افتتاح پر رکھی گئی، جس کے پس پردہ ایک اور ہی سیاست موجود ہے۔ سندھ کے محکمہ ترقیات کے مشیر ڈاکٹر قیصر بنگالی نے صوبائی حکومت کو اہم سڑکوں کے نیٹ ورک کا ماسٹر پلان بنا کر دیا، اس نیٹ ورک میں آٹھ اہم سڑکیں تعمیر ہونا تھیں جن سے سندھ کے اہم دیہی اضلاع ایک دوسرے سے منسلک ہو سکتے تھے۔ یہ ماسٹر پلان سندھ حکومت نے منظور بھی کر لیا تاہم ابھی تک اس پر عملی پیش رفت نظر نہیں آتی کیونکہ اس کو سیاسی حمایت حاصل نہیں۔ گزشتہ 10 برسوں کے دوران سندھ حکومت صرف موجودہ سڑکوں کی مرمت اور بحالی پر ایک ارب روپے سے زائد خرچ کر چکی ہے۔ ضلعی حکومتیں سالانہ منصوبوں میں الگ سے رابطہ سڑکوں کی تعمیر کیلئے فنڈ مختص کرتی ہیں۔ سطحی منصوبہ بندی اور مال کمانے کے چکر میں سندھ کے دیہات کو عملی طور پر کوئی بھی ترقی نہیں دلوائی جا سکتی۔ دیہی ترقی ایک مکمل سائنس ہے جس کی مہارت تو موجود ہے تاہم اس کی پیش رفت کیلئے سیاسی عزم کی ضرورت ہے۔ جاگیردار ٹولہ دیہات کو شہروں سے منسلک کرنے کیلئے ان اہم سڑکوں کی تعمیر آسانی سے ہونے نہیں دے گا، جبکہ رابطہ سڑکوں کو ترجیحی حیثیت حاصل رہے گی۔ سب جانتے ہیں کہ یہ رابطہ سڑکیں آمدن کا اچھا ذریعہ ہیں، ان کی آڑ میں نہ صرف سیاسی بنیادوں پر ٹھیکے دینے کا کاروبار جاری رہتا ہے بلکہ یہ افسر شاہی اور سیاستدانوں کی تجوریاں بھرنے کا بھی اہم ذریعہ ہیں۔ دوسرا اہم کام یہ کیا گیا کہ دیہات کے انفرااسٹرکچر میں کوئی بھی اصلاح نہیں کی گئی، یہی وجہ ہے کہ سندھ کے ضلع ہوں یا تحصیل ہیڈکوارٹرز ہر جگہ گلیوں، نکاسی آب، برساتی پانی کے اخراج کی سہولتوں اور بجلی کے نظام کو اصلاح کے بجائے گزشتہ برسوں کی طرح برباد رکھا گیا، رہی سہی کسر برساتوں اور سیلاب نے پوری کر دی، ایک جانب تو کراچی اور حیدر آباد میں شہری تنظیم نے اپنے علاقوں میں انفرااسٹرکچر کو قابل دید بنایا ہے تو دوسری طرف باقی سندھ اسی

طرح کھنڈر ہے جس طرح مشرف کے دور میں تھی۔ اس بات کو اس وقت حزب اختلاف میں بیٹھی ہوئی پیپلز پارٹی تنقید کا نشانہ بناتی تھی۔

اس ضمن میں تیسرا کام یہ کیا گیا کہ حالیہ حکومت میں شامل وڈیروں نے دیہات میں معاشرتی تبدیلی میں رکاوٹ بنتے ہوئے صنعتیں پروان چڑھانے کی حوصلہ افزائی نہیں کی، حکومتی سربراہوں کی جانب سے دیہی علاقوں میں صنعتی زونز کے قیام کے اعلانات تو کئی بار سننے کو ملے جن میں کہا جاتا تھا کہ سندھ کے دیہات میں معاشی انقلاب لانے کیلئے صنعتی زون قائم کیے جائیں گے لیکن اب یہ حکومت اپنی مدت مکمل کرنے کو ہے تو سندھ کے دیہات میں نمایاں صنعتی سرمایہ کاری نظر نہیں آ رہی بلکہ نیم شہری اور دیہی علاقوں میں چلنے والے چھوٹے بڑے کاروبار بھی بدامنی اور لوڈشیڈنگ سے بے حال ہیں۔

سندھ میں نوجوانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کیلئے اہلیت اور مسابقت کے ذریعے آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کرنے کے بجائے انہیں روایتی شارٹ کٹ تک محدود رکھنے کیلئے سفارشی ملازمتوں اور سرکاری وظائف تک محدود رکھا گیا۔ سیاسی بنیادوں پر ملنے والے وظائف پر اربوں روپے اڑائے گئے۔ حکومتی وڈیرے سندھ کے دیہات میں بنیادی تبدیلی کے روحانی مخالف ہیں اس لیے انہیں ڈیڑھ ماہ سے بند سندھ یونیورسٹی کی ذرا برابر پرواہ نہیں تھی۔ ان کا اس بات سے کیا تعلق کہ سندھ کے مستقبل کا مفاد کن کاموں سے وابستہ ہے۔ جاگیردارانہ قیادت کی ہر ممکن کوشش ہے کہ سندھ کے دیہات میں شہری ترقی کا ماحول عام نہ ہو اور نہ ہی دیہی علاقوں سے لوگ آ کر شہروں میں آباد ہو سکیں۔ اسی لیے وہ دیہات کے پیداواری نظام کو فرسودہ زرعی نظام کے ذریعے مفلوج رکھنا چاہتے ہیں۔ زرعی بنیاد پر صنعتکاری کو بھی قدم جمانے نہیں دیا جا رہا۔ سندھی متوسط طبقے کی نمو کیلئے ضروری ہے کہ متوسط طبقے کے سیاسی اور غیر سیاسی ادارے متبادل حکمت عملی تشکیل دے کر سرکاری ڈھانچے سے باہر معاشرتی نمو کی راہیں تلاش کریں۔

سیاسی اور معاشی میدان میں پسماندہ رکھا جانے والا سندھ

پاکستان کے آج کے منظر نامے میں سندھ کہاں کھڑا ہے؟ یا پھر یہ کہا جائے کہ پاکستان کے موجودہ فریم ورک میں سندھ اور سندھیوں کا مستقبل کیا ہے اور انہیں اپنے مستقبل کو محفوظ اور بہتر بنانے کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے؟ اگر آج کے پاکستان میں طاقت کے مختلف مراکز کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کہ سندھی اور بلوچ اس ملک کی سب سے زیادہ نظر انداز اور پسماندہ رکھی گئی (میں یہاں صرف ''پسماندہ'' کی بجائے ''پسماندہ رکھی گئیں'' کو زیادہ موزوں سمجھ رہا ہوں) اقوام ہیں۔ پاکستان میں حکمران ڈھانچے کے اندر طاقت کے دو اہم مراکز نان سویلین اور سویلین اسٹیبلشمنٹ ہیں جبکہ سماجی اور معاشی ڈھانچے کے اہم مراکز صنعت، زراعت، چھوٹے اور درمیانے کاروبار والے دیہی علاقوں کا معاشی ڈھانچا اور بڑی سطح پر ملکی اور بیرونی، ریزکی یا تھوک والے کاروباری مراکز کا شہری ڈھانچا ہیں۔ جیسا کہ سیاسی حکمرانی اور معاشی میدان کسی بھی قوم کے زندہ، متحرک اور مستحکم ہونے کے اہم بنیادی پیمانے فراہم کرتے ہیں، اس لیے سندھیوں کے اس ملک میں حصے اور اہمیت کا تعین بھی انہی میدانوں کا جائزہ لینے کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔

سیاسی حکمرانی کی طاقت کے مراکز

پاکستان کے چند ابتدائی سالوں کے دوران بیوروکریسی کے راج کے بعد ملک پر اصل حکمرانی نان سویلین طاقتوں کی رہی ہے اور روزمرہ کے کاروبار چلانے میں سول بیوروکریسی اس کا ہاتھ بٹاتی

رہی ہے۔ اس طرح پاکستان کی سیاسی طاقت کے اصل مراکز عوام یا ان کے منتخب شدہ ایوان نہیں بلکہ نان سویلین اور سویلین اسٹیبلشمنٹ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ان دونوں میدانوں سے سندھیوں کو پہلے دن سے باہر رکھا گیا ہے۔ وقت نے ثابت کیا ہے کہ نان سویلین اور سویلین اسٹیبلشمنٹ اصل سیاسی حکمرانی کے مراکز ہیں۔ پنجاب تو قیام پاکستان سے پہلے ہی فوجی طاقت کا مرکز تھا۔ انگریز سرکار کی سب سے زیادہ وفادار فوج پنجاب میں تھی اس لیے روزِ اوّل سے ہی پنجاب میں فوجی اداروں کو پروان چڑھایا گیا۔

عائشہ صدیقہ نے اپنی مشہور کتاب ''ملٹری انک'' میں بتایا ہے کہ پاکستان آرمی، نیوی اور ایئر فورس میں کل 650,000 فوجی بھرتی ہیں جن کے 75 فی صد (یعنی تقریباً پونے پانچ لاکھ کے قریب) کا تعلق پنجاب سے ہے، 20 فی صد کے قریب (تقریباً سوا لاکھ) صوبہ سرحد سے ہیں جبکہ سندھ اور بلوچستان کا حصہ کل 5 فیصد (تقریباً 32 ہزار) ہے۔ حالیہ برسوں میں سندھیوں کو فوج میں پاؤں رکھنے کا کچھ موقع ملا ہے۔ جنرل (ر) مشرف نے 5 مئی کو نوکوٹ میں جلسے سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ سندھ سے 75 ہزار فوجی آرمی میں موجود ہیں۔ یہاں پر یہ بات واضح نہیں کہ سندھ کے کھاتے میں کتنے غیر سندھی اس تعداد کا حصہ ہیں۔ اس طرح مجموعی طور پر دیکھا جائے تو فوج میں سندھ کا حصہ بہت کم ہے اور اس میں بھی سینئر افسروں کی تعداد شاید انگلیوں پر گنتی کے برابر ہو۔ اس تناسب سے دیکھا جائے تو فوج سے منسلک اداروں جیسا کہ این ایل سی کے سات ہزار، فوجی فاؤنڈیشن کے چھے سے سات ہزار اور آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کے پانچ ہزار ملازمین میں بھی سندھیوں کا حصہ معمولی ہوگا۔ سندھیوں کو فوج میں مناسب حصہ دینے کا مطالبہ 50ء کی دہائی سے ہی ہوتا آ رہا ہے اور سندھ مسلم لیگ کونسل نے اس مد میں ایک قرارداد بھی منظور کی جب کہ ایوب کھوڑو، سندھ رجمنٹ بنانے اور سندھ میں فوجی تربیت کے مراکز قائم کرنے کے مطالبات عوامی جلسوں میں بھی کرتے رہے۔ یہ اعداد و شمار اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ طاقت کے بنیادی مرکز یعنی فوج میں سندھیوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ فوج میں زیادہ حصہ نہ ہونا اور یوں زندگی کے باقی تمام شعبوں میں بھی کمزور نمائندگی والی حقیقت کو سمجھنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے۔

سویلین بیوروکریسی روزمرہ کے ملکی کاروبار میں ریڑھ کی ہڈی کی اہمیت رکھتی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت اور 90ء کی دہائی میں پیپلز پارٹی کی دو مختصر حکومتوں کے سوا باقی ملکی تاریخ میں سول بیوروکریسی میں بھی سندھیوں کی نمائندگی انتہائی کمزور رہی ہے۔ بھٹو کے دور میں کوٹہ سسٹم متعارف کرانے کی وجہ سے پہلی بار سندھیوں کے لیے سول بیوروکریسی میں پاؤں رکھنے کی جگہ پیدا ہوئی۔ بدقسمتی سے غیر منتخب شدہ حکومتوں کے دوران سول بیوروکریسی کے اہم عہدوں سے سندھیوں کو دور رکھا جاتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت وفاقی حکومت میں 39 میں سے صرف دو سیکریٹری سندھی ہیں۔ اور تو اور، سندھ حکومت میں بھی سندھی سیکریٹریوں کی تعداد مشکل سے آدھی ہے۔ وفاقی حکومت کی اہم خود مختار اتھارٹیز سے بھی سندھیوں کو دور رکھا گیا ہے۔ نیم خود مختار اور خود مختار کارپوریشنز میں بھی سندھیوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ ایک ایک شعبے کے اعداد و شمار دیکھے جائیں گے تو یہ حقیقت اور بھی عیاں ہوتی جائے گی۔ وفاقی حکومت کی جانب سے جنوری 2007ء میں جاری کئے گئے اعداد و شمار کے مطابق ملک میں 17 سے 22 ویں گریڈ کے کل 12,133 افسران تھے جن میں سے سندھ کا ڈومیسائل رکھنے والے افسران کی تعداد صرف دو ہزار تھی، ان میں بھی 766 کا تعلق کراچی سے تھا جبکہ جعلی ڈومیسائل رکھنے والوں اور غیر سندھیوں کی تعداد کا کچھ پتا نہیں۔ اس ہی رپورٹ کے مطابق وفاقی حکومت کے گریڈ ایک سے لے کر گریڈ 22 تک کے کل 358,130 ملازمین میں سندھ کے صرف 58,089 ملازمین تھے۔ اس رپورٹ کے مطابق سن 2001ء سے لے کر 2005ء تک 19 سے 21 گریڈ کے 416 افسران کی ترقی ہوئی جن میں سندھ دیہی کے صرف 34 افسران شامل تھے۔ یہ اعداد و شمار ثابت کر رہے ہیں کہ خاص طور پر غیر نمائندہ حکومتوں میں سندھیوں کی نمائندگی آٹے میں نمک سے بھی کم ہوتی ہے۔ لحاظا ترقی، روزگار اور زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی سندھ ہمیشہ خسارے میں رہا ہے۔ حتیٰ کہ چند منتخب حکومتوں کا رویہ بھی سندھ کے ساتھ کوئی مختلف نہیں رہا ہے۔ 90ء کی دہائی میں نواز لیگ کی دونوں حکومتوں نے اس سے پہلے پیپلز پارٹی کے ادوار میں شروع کرائے گئے ترقیاتی منصوبوں پر کام بند کروا دیا اور ملازمتیں حاصل کرنے والے سندھ باسیوں کو فارغ کر کے ان کی جگہ اپنی پسند کے لوگ بھرتی کرا دیئے۔ اس طرح ملکی طاقت کے دو اہم مراکز یعنی سویلین اور نان سویلین بیوروکریسی میں مجموعی طور پر سندھ کی نمائندگی محدود رہی ہے۔

اسی طرح سماجی اور معاشی شعبوں میں طاقت کے اہم مراکز میں بھی سندھ کے ساتھ ناانصافی کی ایک طویل تاریخ ہے۔ ویسے تو ان زیادتیوں کی تفصیلات کو اس مضمون میں سمیٹنا ناممکن ہے لیکن صورت حال کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہم یہاں پر زراعت اور صنعت کے دو شعبوں کا ایک مختصر جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

زراعت کے شعبے میں ترقی کے لئے پانی، زمین اور زرعی سہولیات (جیسا کہ بیج، کھاد، مشینری اور قرض وغیرہ) بنیادی ضروریات ہیں۔ ان میں سے کسی ایک سہولت کا میسر نہ ہونا یا ناکافی ہونا تمام شعبے کے لیے بدحالی کا باعث بنتا ہے۔ پانی کے معاملے پر تو اتنا لکھا گیا ہے کہ یہاں پر اس معاملے کو دہرانے کے بجائے ہم زمین اور دیگر پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں۔

زراعت کا بنیادی عنصر زمین ہوتی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل سندھ میں سکھر بیراج 1932ء میں بن کر مکمل ہو چکا تھا جبکہ بعد ازاں دو نئے بیراج گڈو اور کوٹری تعمیر کئے گئے۔ ان بیراجوں پر لاکھوں ایکڑ نئی زمین زیر کاشت آئی جس کو لوٹ کے مال کی طرح غیروں کے حوالے کیا گیا۔ خاص طور پر ون یونٹ کا دور تو جیسے سندھ کے اوپر فاتحوں کی حکمرانی کا دور تھا، جس کے دوران ساڑھے چھے لاکھ ایکڑ پر مشتمل زرخیز زمین غیر سندھیوں کو الاٹ کی گئی جن میں اکثریت حاضر سروس اور ریٹائرڈ فوجی یا وفاقی سرکار کے افسروں کی تھی۔ آیئے تینوں بیراجوں پر زیر کاشت آنے والی زمینوں کا حساب کتاب کر کے معلوم کریں کہ وہ کس کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

سکھر بیراج 1932ء میں بن کر مکمل ہوا جس کے ذریعے تقریباً 28 لاکھ ایکڑ زمین قابل کاشت ہوئی۔ سائیں جی ایم سید نے اپنے عدالتی بیان ''سندھ بولتا ہے'' میں بتایا ہے کہ ون یونٹ قائم ہونے تک (1954ء تک) سکھر بیراج کی تمام زمین بٹ چکی تھی اور باقی چھے لاکھ 42 ہزار زمین رہ گئی تھی۔ ون یونٹ سے پہلے تک 22 لاکھ ایکڑ زمین بٹ چکی تھی یعنی اس کا بڑا حصہ غیر مقامی افراد کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اکتوبر 1958ء سے مارچ 1963ء تک تقسیم شدہ زمین

کا 75 فیصد حصہ غیر سندھیوں کے حوالے کیا گیا تھا۔ 1963ء کے اعداد و شمار کے مطابق اس عرصے کے دوران غیر سندھیوں کو 3 لاکھ 67 ہزار ایکڑ زمین الاٹ کی گئی تھی جبکہ صرف ایک لاکھ 78 ہزار ایکڑ زمین مقامی لوگوں کے حصے میں آئی۔

کوٹری بیراج 1955ء میں مکمل ہوا جس کے تحت 16 لاکھ ایکڑ زمین زیر کاشت آنے کی امید تھی۔ جون 1958ء میں زمین کی تقسیم کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کے اراکین وفاقی سرکار اور فوج سے لئے گئے۔ کل 11 لاکھ 30 ہزار ایکڑ زمین تقسیم کی گئی جس کا 75 فیصد غیر مقامی افراد کے حوالے کیا گیا، جن کی اکثریت وفاقی حکومت کے افسران اور فوجی افسروں کی تھی۔

60ء کی دہائی میں گڈو بیراج تعمیر ہوا۔ اس بیراج کی زمینوں کی تقسیم بھی اسی طرح کی گئی اور ایک لاکھ 42 ہزار ایکڑ زمین غیر مقامی افراد کے حوالے کی گئی جس میں ایک لاکھ تین ہزار ایکڑ زمین ریٹائرڈ فوجی سپاہیوں میں تقسیم ہوئی۔ اسلام آباد اور منگلا ڈیم کے متاثرہ لوگوں کے لیے بھی ساڑھے 37 ہزار ایکڑ زمین رکھی گئی۔ یہ تو صرف بیراجی زمین کے اعداد و شمار ہیں۔ اس کے علاوہ کراچی میں پورٹ قاسم اتھارٹی، اسٹیل مل اور دیگر ترقیاتی منصوبوں کے لیے سندھیوں کی لاکھوں ایکڑ زمین وفاقی حکومت اور خودمختار اداروں کے حوالے کی گئی۔ 1984ء میں ٹھٹھہ ضلع کی 40 ہزار ایکڑ زرخیز زرعی زمین کراچی کے صنعتکاروں کو 7 روپے فی ایکڑ کے حساب سے لیز پر دی گئی۔ اب تو ابراہیم حیدری کے قریب 12 ہزار ایکڑ پر مشتمل دو جزیرے اور ہاکس بے کی پٹی میں 40 ہزار ایکڑ زمین غیر ملکی کمپنیوں کے حوالے کی جا رہی ہے۔ اس طرح سندھ کی زمین کی لوٹ مار کی تفصیلات اتنی طویل ہیں کہ ان پر الگ کتابیں لکھنے کی ضرورت ہے۔

دوسری جانب سندھ میں بیراجوں کے ساتھ سیم والے پانی کی نکاسی کا نظام بروقت مہیا نہ کرنے کی وجہ سے سیم اور تھور کی وجہ سے زرخیز زمینوں کی جو تباہی ہوئی اس کی تفصیلات بھی کافی طویل ہیں۔ اکتوبر 1997ء کی اعداد و شمار کے مطابق سندھ کی تقریباً ایک کروڑ 43 لاکھ قابل کاشت زمین میں سے

تقریباً 37 لاکھ زمین شدید سیم وتھور کا شکار تھی، جس کی پانچ فٹ کی گہرائی پر پانی موجود تھا جبکہ مزید 49 لاکھ ایکڑ زمین میں دس فٹ کی گہرائی میں زیر زمین پانی تھا۔ ایک طرف زمین کی تباہی اور دوسری جانب پانی کے حصے میں زبردستی کٹوتی کے نتیجے میں سندھ کی زرعی معیشت کو شدید دھچکا لگا۔ 90ء کی دہائی میں یہ صورت حال مزید خراب ہوگئی۔ ورلڈ بینک کی ایک ڈرافٹ رپورٹ PK-35001 کے مطابق 2003-1999ء کے برسوں کے دوران سندھ میں گندم کی پیداوار میں سات فیصد، چاول میں دس فیصد، دالوں میں سات فیصد اور سبزیوں کی پیداوار میں ایک فیصد کمی ہوئی۔

زرعی قرضوں کے حوالے سے بھی سندھ کو زیادتی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ 01-2000ء میں زرعی قرضوں میں سندھ کا حصہ 21 فیصد تھا جو 06-2005ء میں کم ہوکر 11 فیصد رہ گیا۔ 06-2005ء میں سندھ کے لیے زرعی قرضوں کی مد میں 137 ارب روپے مختص کیے گئے جس میں سے صرف 14.8 ارب روپے جاری کیے گئے جو کل رقم کا گیارہ فیصد بنتا ہے جبکہ پنجاب کو 82 فیصد دیا گیا۔ بیج، کھاد، زرعی ادویات، مشینری، ٹیوب ویل، انفراسٹرکچر، نرخوں کے تعین وغیرہ میں زیادتیوں کی تفصیلات الگ ہیں۔ سندھ کی زرعی معیشت گذشتہ ڈیڑھ دہائی سے جس بحران کا شکار ہے اس نے سندھ میں غربت کو فروغ دیا، جس کے نتیجے میں قبائلی تنازعات، ڈکیتیوں، قتل، خودکشیوں اور دیگر جرائم میں اضافہ ہوا ہے۔ ہر سال آٹے اور چینی کا بحران اب تو معمول بن گیا ہے اور زرعی معیشت خراب صورت حال کا شکار ہے۔

معاشی ترقی کا ایک اور اہم پہلو صنعتی ترقی ہے۔ سندھی سماج جیسا کہ ایک طویل عرصے سے جاگیردارانہ ڈھانچے کے تحت رہا ہے اس لیے اس کی دیہی معیشت کا زیادہ تر انحصار زراعت پر رہا ہے۔ صنعت کی جانب رجحان نہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف صنعتیں قائم نہ ہوسکی ہیں بلکہ بہ یک وقت صنعتی لیبر بھی تیار نہیں ہوا جو شہروں کے صنعتی ماحول میں روزگار کے مواقع حاصل کرسکے۔ تقسیم کے وقت اندرون سندھ میں صنعت محدود پیمانے پر موجود تھی۔ انفراسٹرکچر اور ہیومن ریسورس نہ ہونے کے باعث دیہی علاقوں میں صنعتی بنیادیں قائم نہ ہوسکیں۔ دوسری جانب کراچی میں بندرگاہ

اور ایئرپورٹ وغیرہ کی وجہ سے صنعتی ترقی اور انفراسٹرکچر پہلے سے موجود تھا۔ اندرون سندھ کے علاقوں میں سکھر بیراج کی تعمیر کے بعد کچھ شہر، منڈیاں اور چھوٹی فیکٹریاں قائم ہوئیں۔ نوابشاہ، حیدرآباد اور تھرپارکر میں زرعی نوعیت کی فیکٹریاں قائم کی گئیں۔ شمالی سندھ کے شہروں سکھر اور خیرپور میں بھی کچھ صنعتیں موجود تھیں۔ 1954ء میں خیرپور میں تین ٹیکسٹائل فیکٹریاں، جننگ فیکٹریاں، تمباکو سکھانے کے کارخانے اور کھڈیاں موجود تھیں۔ پاکستان بننے کے وقت 1947ء میں سندھ میں کچھ چاول صاف کرنے کے کارخانے، تیل کے کارخانے اور آٹے کی چکیاں موجود تھیں۔ روہڑی میں ایک سیمنٹ فیکٹری تھی، حیدرآباد میں ایک برف کا کارخانہ، 25 کاٹن جننگ فیکٹریاں، ایک آئل مل اور ایک چمڑے کا کارخانہ تھا جبکہ کراچی میں 41 مینوفیکچرنگ یونٹ تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ہندوستان سے آنے والوں کو شہری کاروبار اور صنعت میں آگے بڑھانے کے لیے خاص وسائل فراہم کیے گئے لیکن باقی سندھ اس طرح کی کوئی شروعات نہیں کی گئی جس سے بتدریج صنعتی ترقی کی بنیادیں ڈالی جاسکتیں۔ 1948ء میں حکومت پاکستان نے ''پاکستان رفیوجی ری ہیبی لیٹیشن فنانس کارپوریشن'' کی بنیاد رکھی۔ کارپوریشن کی سندھ برانچ نے ایک شیشے کا کارخانہ ہتھیا کر فیروزآباد سے ہجرت کر کے آنے والوں کی ایک بڑی تعداد کو ملازمتیں فراہم کیں۔ 1950ء تک وہ کارپوریشن 40 لاکھ روپے تقسیم کر چکی تھی جبکہ باقی سندھ کے لیے اس قسم کا کوئی فنڈ موجود نہیں تھا۔ 1947ء میں ''سندھ ٹریڈنگ اسٹیٹ'' کی بنیاد رکھی گئی اور ستمبر 1947ء میں اس کے پہلے کارخانے ''ولیکا ٹیکسٹائل مل'' کا سنگ بنیاد خود قائداعظم محمد علی جناح نے رکھا۔ بعدازاں حیدرآباد، کوٹری، ٹنڈوآدم، نوابشاہ، لاڑکانہ وغیرہ میں بھی سائٹ ایریاز قائم کیے گئے لیکن وہ کراچی کے مقابلے میں بہت چھوٹے تھے اور سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے وہاں پر ویرانی کا عالم تھا۔ اس وقت شمالی سندھ کے ضلع گھوٹکی سے لے کر لاڑ کے ضلع بدین اور ٹھٹھہ تک خاص طور پر دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر اور سپر ہائی وے پر چھوٹی صنعتوں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے لیکن کراچی کے مقابلے میں وہ اتنا محدود ہے کہ سندھ کا پیداواری نظام کسی نمایاں تبدیلی سے نہیں گزر سکا ہے۔ ان بڑے کارخانوں میں چاہے لیبر ہو یا انتظامیہ سندھی بمشکل ہی نظر آتے ہیں۔ پہلے تو سندھ میں ہیومن ریسورس نہ ہونے کا بہانہ ہوتا تھا لیکن اب تو سندھ میں انجینئرنگ یونیورسٹیاں موجود ہیں

جہاں سے ہر سال سینکڑوں ڈگری یافتہ نوجوان مارکیٹ میں آتے ہیں لیکن اس کے باوجود صنعتوں میں ان کے لیے روزگار کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ کراچی اس وقت صنعتی سرگرمی کا سب سے بڑا مرکز ہے جس میں چار بڑے صنعتی علاقے موجود ہیں، کورنگی، سائیٹ، فیڈرل بی ایریا اور نارتھ کراچی۔ ان کے صنعتی علاقوں میں تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار چھوٹے بڑے کارخانے ہیں۔ صنعتی حلقوں کے مطابق ان کارخانوں میں تقریباً 25 لاکھ لوگ کام کر رہے ہیں جن میں تقریباً 13 لاکھ کراچی کے، ساڑھے پانچ لاکھ پنجاب کے اور تقریباً چار لاکھ لوگ صوبہ سرحد کے ہیں۔ اندرون سندھ کے مزدوروں کی تعداد دو لاکھ کے قریب بتائی جاتی ہے، جس میں بھی ایک بڑی تعداد غیر سندھیوں کی ہوسکتی ہے۔

2000-01ء میں کی گئی صنعت شماری کے مطابق سندھ میں مینوفیکچرنگ انڈسٹریز کی تعداد 1768 تھی جن میں سے 1218 صرف کراچی میں تھیں جبکہ باقی پورے سندھ میں صنعتوں کی تعداد صرف 550 تھی۔ 1983ء میں سپر ہائی وے پر نوری آباد انڈسٹریل ایریا قائم کیا گیا جس میں 600 صنعتوں کی گنجائش تھی اور اس لحاظ سے نوری آباد، جنوبی ایشیا کا سب سے بڑا صنعتی مرکز بن سکتا تھا۔ اس صنعتی علاقے کی کاغذی تیاری ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں کی گئی لیکن اس کی زمینی بنیاد جنرل ضیاالحق کے دور میں ڈالی گئی۔ جونیجو حکومت نے اس کو دس سال کے لئے ٹیکس سے مستثنیٰ علاقہ قرار دیا۔ 1988ء تک وہاں 72 صنعتی یونٹ قائم ہو چکے تھے لیکن آگے چل کر اس علاقے میں بدامنی کو بنیاد بنا کر اس کی ترقی کو روکا گیا اور وہاں سے کارخانے منتقل یا بند ہونا شروع ہوئے۔ 1999ء میں وہاں صرف 20 کارخانے رہ گئے تھے۔ حالاں کہ وہاں کی مقامی آبادی کو اس صورتحال کا ذمہ دار قرار دیا گیا لیکن یہ بات مکمل سچ نہیں ہے۔ حقیقت میں جان بوجھ کر اس صنعتی علاقے کی ترقی کو روکنے کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے گئے۔ مثال کے طور پر 16 سال گزرنے کے باوجود اس علاقے کو بجلی اور گیس کے کنکشن فراہم نہیں کئے گئے۔ 2003ء میں سندھ کے گورنر محمد میاں سومرو نے گیس کنکشن فراہم کیے تاہم امن وامان کی صورتحال بہتر ہونے کی وجہ سے وہاں کچھ بہتری ہوئی اور ستمبر 2006ء کی ایک رپورٹ کے مطابق وہاں 96 صنعتی یونٹ کام کر رہے تھے۔

نوری آباد کی مقامی آبادی میں تعلیم و ہنر کی کمی کی بنیاد پر ملازمتوں میں ان کی نمائندگی بہت کم ہے۔ تاہم یہ تاثر بھی عام ہے کہ سندھی مزدور کام کم کرتا ہے اور یونین بازی کی سیاست میں زیادہ ملوث ہوتا ہے۔ دادو شوگر مل اور ٹھٹھہ شوگر مل کے بند ہونے کے اسباب بھی یہی بتائے جا رہے ہیں جبکہ ان اسباب کے علاوہ ان ملوں میں راشی انتظامیہ مقرر کرنے اور مقامی سیاسی وڈیروں کی جانب سے کروڑوں روپے کے قرضے واپس نہ کرنے جیسے اسباب کا ذکر تک نہیں کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کراچی سے باہر باقی سندھ میں صنعتی ترقی کے لیے ماحول میسر کیا گیا نہ ہی سرمایہ داروں کو ایسی ترغیبات دی گئی جس سے سندھ کے دیہی علاقوں میں صنعتیں لگانے کے لئے کوئی سرمایہ کاری ہو سکے۔

یوں صنعت و زراعت کے دو اہم میدانوں میں سندھ کو کمزور رکھا گیا ہے جبکہ صنعتی میدان میں سندھ کے دیہی علاقوں کو کراچی کے مقابلے میں پسماندہ رکھا گیا ہے۔ سندھ کے ابھرتے ہوئے نیم شہری ضلعی ہیڈ کوارٹروں میں ابتدائی طور پر چھوٹی صنعتوں کو تقویت دی جا سکتی ہے لیکن اس کے لئے مخلصانہ کوششوں کی ضرورت ہوگی۔ چوں کہ سندھ کے اوپر طویل عرصے سے کمزور حکمرانوں کو مسلط کیا جاتا رہا ہے لہٰذا وہ اپنے دور حکومت کا زیادہ تر عرصہ اپنی کرسی بچانے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں اور سندھ کے دیہی علاقوں کی ترقی کے لئے سوچنے کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔

(روزنامہ ''کاوش''، 7 دسمبر 2007ء)

ذوالفقار آباد۔سندھیوں کیلئے نیا طوق

ابھی بلدیاتی اداروں کے دوہرے نظام اور صوبے کی تقسیم کے معاملے سے اٹھنے والی گرد بیٹھی ہی نہ تھی کہ حکومت نے سندھ میں ذوالفقار آباد کی تعمیر کے کام کے فوری آغاز کا اعلان کر دیا ہے۔ 2009ء میں جھرک شہر کے نام سے شروع ہونے والے اس منصوبے کو ذوالفقار آباد کا لبادہ اوڑھا کر اس کو شہید بھٹو کی سوچ اور فکر سے جڑا ہوا شہر قرار دیا گیا۔ اپنے اقتدار کے آخری سال میں پیپلز پارٹی نے سندھیوں کے گلے میں یہ نیا طوق ڈالنے کیلئے اس پر کام کی رفتار تیز کر دی ہے اور سندھ کابینہ ماسوائے سسئی پلیجو کے اس منصوبے کی منظوری بھی دی چکی ہے۔ سندھ کابینہ کے کسی بھی وزیر کو اس منصوبے کی تفصیلات کا علم نہیں۔ سندھ کی عوام اس منصوبے کے نفعہ نقصان سے مکمل طور پر لاعلم ہے تاہم اس کے باوجود شفافیت اور عوام دوستی کی دعویدار حکومت اس منصوبے پر اپنی تمام توانائیاں خرچ کرنے کیلئے بے تاب ہے۔

اس منصوبے پر عملدرآمد کی نگرانی کیلئے 2010ء میں حکومت سندھ کے ایک ایکٹ کے تحت ذوالفقار آباد ڈویلپمنٹ اتھارٹی قائم کی گئی اس کا موجودہ ایم ڈی سید افتخار حسین پاکستانی فوج کا ایک ریٹائرڈ اہلکار ہے۔ اتھارٹی کے سربراہ عملاً بے اختیار وزیراعلیٰ سندھ ہے جو اوپر سے آئے ہر حکم پر قبول ہے کے سوا کچھ بھی اور نہ کہنے کی شاندار تاریخ کا مالک ہے۔

کھربوں روپے کے اس منصوبے کے حوالے سے سرکاری طور پر کوئی تفصیلات سامنے نہیں لائی گئیں۔ مختلف دستاویزات' پریزنٹیشنز اور اجلاسوں کی کارروائیوں سے صرف مندرجہ ذیل معلومات حاصل ہوسکی ہے۔ ذوالفقار آباد اتھارٹی کی سرکاری ویب سائٹ پر اتنے اہم منصوبے کو محض ایک صفحے میں بیان کردیا گیا ہے۔ اس مختصر نوٹ میں بھی نئے شہر سے متعلق روایتی لفاظی کے علاوہ کوئی بنیادی ٹھوس معلومات نہیں دی گئی۔ مختصر نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ کراچی سے 150 کلومیٹر کے فاصلے پر یہ شہر قائم کیا جائے گا جس کیلئے سندھ حکومت نے ساڑھے تین لاکھ ایکڑ اراضی مختص کی ہے جبکہ مزید ساڑھے نو لاکھ ایکڑ اراضی سمندری لہروں کو پیچھے دھکیل کر حاصل کی جاسکتی ہے۔ اپریل 2011ء میں اتھارٹی کی جانب سے منصوبے کے تصوراتی ماسٹر پلان کیلئے جاری کیے گئے اظہار دلچسپی کے نوٹس میں بھی کام کی نوعیت سے متعلق محدود معلومات دیتے ہوئے محض 13 لاکھ 32 ہزار ایکڑ اراضی دستیاب ہونے کے اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں۔ ٹیبل میں کیٹی بندر' کھارو چھان' شاہ بندر اور جاتی کی تحصیلوں میں موجود اراضی کی تفصیلات اس طرح بیان کی گئی ہیں۔

نمبر شمار	تحصیل	زیر سمندر اراضی (ایکڑ)	دستیاب اراضی (ایکڑ)	کل اراضی (ایکڑ)
01	کیٹی بندر	89,052.22	1088	90,140.22
02	کھارو چھان	167,575.19	25,696.25	193,272.4
03	شاہ بندر	535,238.05	29,989.10	565,277.15
04	جاتی	175,175.09	308,537.14	483,712.23
	کل			1332,352.24

حکومت سندھ کے محکمہ ریونیو کی جانب سے تیار کی گئے ایک اور پریزنٹیشن میں اس منصوبے کیلئے دو آپشن پیش کیے گئے۔ پہلے آپشن کے طور پر ضلع ٹھٹہ کے مذکورہ بالا 4 تحصیلوں کو اس منصوبے میں

شامل کرنے کی تجویز دی گئی۔ اس آپشن کے تحت پریزنٹیشن میں یہ بتایا گیا ہے کہ 12 لاکھ 90 ہزار ایکڑ اراضی اس منصوبے کے زیر استعمال لائی جاسکتی ہے۔ جس میں سے تین لاکھ 35 ہزار ایکڑ کو جنگلات اور بے نامی دکھا کر فوری دستیابی کی نوید دی گئی جبکہ 9 لاکھ 55 ہزار اراضی سمندر کی لہروں کو بند باندھ کر پیچھے دھکیلنے کے ذریعے قابل استعمال بنانے کی تجویز دی گئی تھی۔ پریزنٹیشن میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس منصوبہ کی توسیع کیلئے جھرک شہر کے جنوب مشرقی سمت بھی جایا جاسکتا۔

دوسرے آپشن کے طور پر یہ منصوبہ سپر ہائی وے اور نیشنل ہائے وے کے درمیان میں تعمیر کرنے کا مشورہ دیا گیا' جس میں سجاول' میر پور بٹھورو' گھوڑا باڑی' میر پور ساکرو' ٹھٹہ اور جامشورو میں موجود اراضی کے اعداد و شمار دیئے گئے ہیں جن کے مطابق چھ لاکھ 60 ہزار ایکڑ اراضی کی دستیابی دکھائی گئی ہے جن میں سے 74 ہزار ایکڑ اراضی فوری طور پر دستیاب ہوگی۔ اس آپشن میں مزید بتایا گیا کہ کوہستان میں ساڑھے تین لاکھ ایکڑ زمین جعلی کھاتوں پر موجود ہے جبکہ ضلع جامشورو کے حدود میں بھی ایک لاکھ ایکڑ کے جعلی کھاتے بنے ہوئے ہیں۔ پریزنٹیشن میں بتایا گیا ہے کہ بہ یک جنبش قلم یہ کھاتے رد کر کے اراضی سندھ حکومت کے حوالے کی جاسکتی ہے تاکہ اسے ذوالفقار آباد کیلئے زیر استعمال لایا جاسکے۔ پریزنٹیشن میں بتایا گیا ہے کہ بورڈ آف ریونیو یہ اراضی ذوالفقار آباد ڈویلپمنٹ اتھارٹی کو منتقل کرسکتا ہے۔

اب تک حاصل ہونے والی اس محدود معلومات سے زیادہ کوئی بھی تفصیلات منصوبے کے حوالے سے نہیں مل پائیں۔ سندھ کی لاکھوں ایکڑ اراضی پر محیط اور سندھیوں کے قومی وجود کیلئے ضرر رساں اس شہر کے منصوبہ کے حوالے سے سرکاری محکمے اور حکومت مہر بہ لب ہے اور سندھ کے عوام کو کچھ بھی بتانے کیلئے تیار نہیں۔

جیسے ہی صدر مملکت نے جون میں اس منصوبہ کے اہم حصہ کے طور پر ڈھانڈاری کے قریب پونے چار ارب روپے لاگت سے 6 کلومیٹر طویل پل کی تعمیر کے احکامات جاری کیے تو حکومت اور چینی

سرمایہ کاروں کے مابین روابط میں بھی تیزی آ گئی۔صدر آصف علی زرداری کے حالیہ دورہ چین میں مفاہمت کی ایک یادداشت پر بھی دستخط کیے گئے جس کے بعد چینی سرمایہ کاروں کیلئے ذوالفقار آباد میں قدم جمانے کی راہیں مکمل طور پر کھل گئی ہیں۔قبل ازیں 25 اگست 2011ء کو ڈان میں شائع ہونے والی ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ چینی کمپنیوں نے ذوالفقار آباد میں ایک اکنامک زون کی تعمیر کی تجویز دی ہے' جس کے مطابق 15 برس کے اندر یہ زون تعمیر کی جائی گی' اس کی تکمیل پانچ' پانچ برس کے تین مراحل میں ہوگی۔حکومت ان تمام امور میں اتنی جلد بازی دکھا رہی ہے کہ سرکاری شعبہ کے ترقیاتی منصوبہ جات سے متعلق تمام ضوابط کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن کی پراجیکٹ مینجمنٹ گائیڈ لائنز کے مطابق 50 کروڑ روپے سے زائد لاگت کے ہر منصوبے کی منظوری قومی اقتصادی کونسل کی انتظامی کمیٹی یعنی ایکنک سے لینی ہوتی ہے تاہم ذوالفقار آباد منصوبہ کو ایکنک سے منظور نہ کروا کر قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ پیپلز پارٹی جب حزب اختلاف میں تھی تو گریٹر تھر کینال منصوبہ کی ایکنک سے منظوری نہ لیے جانے پر وہ مشرف حکومت پر شدید تنقید کرتی رہی۔اب پیپلز پارٹی کی حکومت نے خود ان ضوابط کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے اس منصوبے کیلئے بجٹ میں رقم مختص کر دی ہے۔اگر یہ منصوبہ مشرف کے دور میں پیش کیا جاتا تو پیپلز پارٹی اس کو سندھ دشمن منصوبہ قرار دیکر طوفان کھڑا کر دیتی۔

ذوالفقار آباد منصوبہ سے سندھ کے مکینوں کو جو فوری خطرہ لاحق ہے وہ ہے سندھ میں سندھیوں کا اقلیت میں تبدیل ہونا اور نئے شہر کی تعمیر کی صورت میں لاکھوں لوگوں کی باہر سے یہاں آمد۔ سندھی پہلی ہی تقسیم کے وقت بیرونی آبادکاری کے باعث کراچی کو گوانے کا تجربہ کر چکے ہیں۔ تقسیم کے وقت کراچی کی آبادی ساڑھے چار لاکھ تھی جس میں 61 فیصد سندھی بولنے والے جبکہ 6.3 فیصد اردو اور ہندی بولنے والے شامل تھے۔تقسیم کے بعد ہونے والی غیر قانونی نقل مکانی کے نتیجہ میں 1951ء کی مردم شماری کے مطابق شہر کی آبادی بڑھ کر ساڑھے 11 لاکھ تک پہنچی جس میں سندھیوں کا تناسب کم ہو کر 8.6 فیصد رہ گیا جبکہ اردو آبادی بڑھ کر 50 فیصد تک پہنچی۔

غیر مقامی آبادی کی مسلسل یلغار کے نتیجے میں 1998ء کی آدم شماری کے مطابق کراچی میں سندھی بولنے والوں کا حصہ محض 7.22 فیصد ہے۔ مردم شماری کے تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ سندھ میں اس وقت 28 لاکھ 32 ہزار افراد نقل مکانی کر کے آئے تھے جن میں سے ساڑھے 25 لاکھ شہری علاقوں میں آ کر آباد ہوئے تھے۔ ان میں سے بھی ساڑھے 21 لاکھ افراد صرف کراچی شہر میں آباد ہوئے۔ غیر قانونی طریقہ سے آئے ہوئے لاکھوں لوگ ان کے علاوہ ہیں۔ نقل مکانی کی کسی یرغال کے نتیجے میں 1998ء کے اعداد و شمار کے مطابق سندھ میں سندھی بولنے والوں کا تناسب تقریباً 60 فیصد تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سندھی اپنی ہی دھرتی پر اقلیت میں تبدیل ہونے سے ذرا ہی دور کھڑے ہیں۔ اگر ذوالفقار آباد جیسا نیا شہر تعمیر ہوا تو اس میں سرمایہ کاری کیلئے کروڑوں نہیں بلکہ اربوں روپے درکار ہوں گے۔ بلاشبہ سسکتی ہوئی دیہی معیشت پر انحصار کرنے والے سندھی اس شہر میں قدم رکھنے کے قابل بھی نہ ہوں گے۔ دیہات کی زرعی معیشت پانی کی مسلسل قلت اور دو بڑے سیلابوں کے نتیجے میں تباہ حال ہے۔ گزشتہ 6 دہائیوں کے دوران دیہی علاقوں میں کوئی بھی نمایاں صنعتکاری نہیں ہوئی اور اس کے نتیجے میں سندھ کے لوگ صنعتی سرمایہ کاری کا کوئی تجربہ بھی حاصل نہ کر سکے۔ ادارہ شماریات کے اعداد و شمار کے مطابق سندھ میں کل 1768 مینوفیکچرنگ یونٹس تھے جن میں سے 1218 کراچی اور 88 حیدرآباد میں واقع تھے، یعنی باقی تمام سندھ میں صرف 480 صنعتی یونٹ موجود تھے۔ اس اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سندھ کی دیہی عوام نئے شہر میں جائیداد خواہ صنعت میں کوئی نمایاں سرمایہ کاری نہ کر پائے گی اور ملک کے دیگر صوبوں اور یہاں تک کے دوسرے ملکوں سے بھی لاکھوں لوگ سندھ پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد سندھی اپنی ہی دھرتی پر عددی اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے۔ نقل مکانی کرنے والے یہ لاکھوں لوگ یہاں کے شناختی کارڈ اور ڈومیسائل بنوا کر ووٹ دینے کا حق بھی حاصل کر لیں گے اور پھر سندھ کا سیاسی مستقبل بھی تاریک ہو جائے گا۔ اس تمام عمل میں زیادہ سے زیادہ دس سے پندرہ سال کا عرصہ لگے گا۔ ذوالفقار آباد سے پیپلز پارٹی کے چند لوگوں تو ارب پتی ہو جائیں گے لیکن سندھیوں کا مستقبل داؤ پر لگا جائیں گے۔

ذوالفقار آباد کے میجنگ ڈائریکٹر نے چین کے شہر شین زین کو ذوالفقار آباد کیلئے اپنا ماڈل قرار دیا ہے اس شہر سے متعلق مختصر معلومات یہ سمجھنے میں سودمند ثابت ہوگی کہ شین زین جیسا شہر ذوالفقار آباد سندھ کے اصل مکینوں کے ساتھ کیا ظلم ڈھائے گا۔ چین کے جنوبی علاقے میں دریائے پرل کے ڈیلٹا میں واقع یہ شہر ہانگ کانگ کے شمال میں واقع ہے۔ چین نے 1980ء کی دہائی میں اس شہر کو بطور اکنامک زون ترقی دلوائی اور اسے نیم صوبائی انتظامی درجہ دیا گیا۔ چین میں Sub-Provincial Division کا مطلب صوبے کے اندر موجود ایک ایسا شہر ہوتا ہے جو صوبے کے زیر انتظام ہونے کے باوجود اقتصادی اور قانونی پہلوؤں کے لحاظ سے انتظامی طور پر الگ ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ جیسے مشرف دور میں کراچی کی شہری حکومت تھی۔

شین زین 1979ء تک مچھیروں کی بستی تھی جس کی آبادی 3 لاکھ کے لگ بھگ ہوگی، شہر کو جدید طرز کا معاشی مرکز بنانے کے بعد اس وقت شہر کی آبادی ایک کروڑ 10 لاکھ کے قریب پہنچ گئی ہے جس میں 60 لاکھ افراد باہر سے آئے ہوئے ورکر ہیں۔ 1980ء سے قبل اس شہر کے پرانے مکینوں کی بڑی زبان Cantonese تھی اب وہاں کی زبان بدل کر Mandarin ہو چکی ہے۔ شہر کے قدیم باسی اپنی شناخت اور کلچر کھو چکے ہیں۔

چین کی ترقی کے اس ماڈل سے ذوالفقار آباد کے میجنگ ڈائریکٹر بہت متاثر ہیں۔ آج ٹھٹہ کے ساحلی علاقے بھی شین زین کی طرح ماہیگروں کی بستیاں ہیں۔ 1998ء کی آدمشماری کے مطابق ان چار تحصیلوں کی موجودہ آبادی 4 لاکھ کے لگ بھگ ہوگی۔ اگر ذوالفقار آباد شہر بن گیا تو سندھی بولنے والے ماہیگیر ان علاقوں میں ویسے ہی ناپید ہو جائیں گے جیسے کراچی کی ترقی کے بعد ہو گئے۔ بات صرف ایک شہر تک محدود نہیں رہے گی بلکہ اس سے پورے صوبے کی ڈیموگرافی مکمل طور پر تبدیل ہو جائیگی اور ایک دو دہائیوں کے اندر سندھی اپنی ہی دھرتی پر اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے۔

چین کی اس خطہ میں دلچسپی اور امریکہ سے اس کی معاشی اور عسکری میدانوں میں شروع ہونے والی سرد جنگ کے حوالے سے میں اپنے ایک اور مضمون میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ گوادر پورٹ کی ترقی کا عمل ٹھپ ہوجانے کے بعد چین اس سمندری پٹی پر ایک اور شہر اور بندرگاہ کے ذریعے امریکہ کے ساتھ سرد جنگ کا نیا محاذ کھولنا چاہتا ہے۔ امریکہ کے ساتھ عسکری تعلقات میں کشیدگی کے بعد پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے اس پر دباؤ بڑھانے کیلئے چین کے ساتھ اپنے تعلقات کو مستحکم بناتے ہوئے متعدد معاہدوں پر کام کیا ہے۔ پاکستان کے شمالی علاقوں میں پانی سے متعلق متعدد منصوبوں میں چین سرمایہ کاری کر رہا ہے جن میں بھاشا ڈیم اور اسلام آباد کو پانی کی فراہمی کے منصوبے بھی شامل ہیں۔ جنوبی علاقے میں سمندری ساحل پر یہ ایک اہم سرمایہ کاری ہوگی جس سے چین بحر ہند اور بحیرہ عرب کے ساحل پر امریکہ کے ساتھ سرد جنگ میں نمایاں پیش رفت کر رہا ہوگا۔ دوسری جانب امریکہ دفاعی حکمت عملی کے تحت بھارت کو نئے معاہدوں کے ذریعے اپنا اتحادی بنا رہا ہے جس کا مقصد چین اور پاکستان دونوں پر دباؤ بڑھانا ہے۔ یہ امکانات بھی موجود ہیں کہ جس طرح گوادر منصوبے کو ناکام بنانے کیلئے منظم خونریزی کروا کر سرمایہ کاروں کو بھگایا گیا اسے طرح سندھ میں چین اور امریکہ کی سرد جنگ کے نتیجے میں امن وامان کی صورتحال خراب کی جائے۔ حالیہ مہینوں میں ہونے والے چند واقعات اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو مزید خطرناک صورت اختیار کر سکتے ہیں۔

اگر حکومت کو سندھ میں ترقی کے عمل سے کوئی دلچسپی ہے تو اس سلسلے میں کراچی میں ترقی سے محروم سندھی اور بلوچ آبادیوں میں ترقیاتی عمل کے آغاز کے ساتھ ساتھ سندھ کے باقی ضلعی ہیڈ کوارٹرز کی ترقی پر وہ وسائل خرچ کیے جائیں۔ کراچی سے باہر سندھ کے بڑے شہروں میں انفرااسٹرکچر انتہائی زبوں حالی کا شکار ہے اس کو بہتر بنانے کیلئے حکومت ہمیشہ محدود وسائل کا عذر پیش کرتی رہی ہے۔ سندھ میں کراچی کے علاوہ کوئی بھی شہر حقیقی معنوں میں شہر نظر نہیں آتا۔ سکھر، دادو، میرپور خاص، نوابشاہ، خیرپور میرس، لاڑکانہ، جامشورو، عمرکوٹ، سانگھڑ، جیکب آباد، گھوٹکی، شکارپور وغیرہ دراصل دیہات کے شہر نما مراکز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پورے ملک اور دیگر صوبوں کے لوگ

کراچی کا رخ کرتے ہیں۔ کراچی پر آبادی کا دباؤ کم کرنے کا حل ذوالفقار آباد کی تعمیر نہیں بلکہ سندھ کے دیگر ڈویژنل اور ضلعی صدر دفاتر کو ترقی دلوانا ہے۔ اس حوالے سے پنجاب کے تجربہ سے استفادہ کرنا چاہیے جس نے لاہور کے ساتھ گجرات' گوجرانوالہ' فیصل آباد' شیخوپورہ' سیالکوٹ اور ملتان جیسے دیگر شہری مراکز قائم کر کے لاہور کو آبادی کے دباؤ سے کسی حد تک بچا رکھا ہے۔ 1998ء میں جب سندھ کی شہری آبادی کا 62 فیصد کراچی میں مقیم تھا۔ پنجاب کی شہری آبادی کا صرف 22.3 فیصد لاہور میں رہتا تھا۔ اب بھی اس تناسب میں کوئی غیر معمولی فرق نہیں آتا ہے۔ سندھ میں غیر مقامی آبادی کی یلغا کا اثر یہ ہوا ہے کہ 1998ء کے اعداد و شمار کے مطابق سندھ کی شہری آبادی میں سندھ بولنے والوں کا تناسب 25.79 فیصد تھا تب پنجاب کی شہری آبادی کا 78.75 فیصد پنجابی بولنے والوں اور پختونخواہ کی شہری آبادی کا 73.55 فیصد پشتو بولنے والوں پر مشتمل تھا۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ذوالفقار سندھ کے شہری علاقوں میں سندھی بولنے والوں کے تناسب کو بالکل اقلیت میں تبدیل کر دے گا۔

سندھ میں رہنے والے ترقی کے خلاف ہرگز نہیں تاہم وہ ایسی ترقی کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں جو ان کے وجود اور شناخت کو ہی ان کی دھرتی سے مٹا دے۔

سندھ کو درپیش مسائل

وطن عزیز کا دوسرا بڑا صوبہ باب الاسلام سندھ ہزارہا سال قدیم ورثہ، زبان، تہذیب اور ثقافت کا حامل خطہ ہے۔ اہل سندھ منفرد روایات اور رسوم و رواج رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب و ثقافت اور زبان و علاقہ کے حوالے سے حد درجہ حساس بھی ہیں اور انہیں ایک عرصہ سے وفاق سے اس امر کی شدید شکایت ہے کہ ان کے وسائل کو بڑی بے دردی سے استعمال تو کیا جاتا ہے لیکن ان وسائل میں سے ان پر بہت کم خرچ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی گوناگوں اور مختلف النوع شکایت اور ناراضیاں ہیں جن کا تذکرہ سندھی اخبارات اور جرائد میں آئے روز تواتر سے ہوتا رہتا ہے۔ پی پی پی کیونکہ اندرون سندھ کے عوام کی اکثریت کی نمائندہ جماعت تصور کی جاتی ہے اس لیے سندھی عوام کو اس سے حد درجہ توقعات وابستہ تھیں، لیکن پی پی پی کی حکومت نے جس طرح اپنے حالیہ 3 سالہ دور اقتدار میں اپنے ووٹرز کی امنگوں اور آرزوؤں پر پانی پھیرا ہے اس کی وجہ سے سندھی اخبارات و جرائد کے تجزیہ نگاروں اور تبصرہ نگاروں کی تحاریر بھی برہمی، یاس، ناامیدی، خودترسی اور خودترحمی کا عنصر صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ لیکن برسرزمین حقائق کا معروضی انداز میں تجزیہ کر کے اپنی خامیوں، کمیوں اور کوتاہیوں کو بے لاگ اور حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ کثیر الاشاعت سندھی روزنامہ ''کاوش'' کی ایک سابقہ اشاعت میں مشہور دانشور اور تجزیہ نگار نصیر میمن نے موجودہ سندھ کے سیاسی و سماجی اور معاشی حالات کے تناظر میں ''سندھ کو درپیش چیلنجز'' کے عنوان سے جو تفصیلی کالم تحریر کیا ہے وہ آج کے صوبہ سندھ کے

دانشوروں، عوام اوران کی فکر وسوچ کے حوالے سے معلومات اور غور وفکر کے نئے در وا کرتا ہے۔ مذکورہ اہم تحریر کے جستہ جستہ اہم نکات قارئین ''فرائیڈے اسپیشل'' کی خدمت میں اس امید کے ساتھ پیش خدمت ہیں کہ اس کے ذریعے سے انہیں آج کے سندھ کی سوچ، حالات اور افکار سے متعلق آگہی حاصل ہوسکے گی۔ (مترجم ابواسامہ تنولی)

''مجھے بخوبی علم ہے کہ ایک ماہ بعد جب سندھ میں گزشتہ برس کے حوالے سے آرٹیکل شائع ہوں گے تو ان کے اعداد وشمار ایجادات اور کامیابیوں پر نہیں بلکہ کاروکاری میں قتل شدہ عورتوں، جرگوں، اغوا شدگان اور سیلاب میں ہلاک شدگان پر مشتمل ہوں گے۔ جتنا موت کی حد تک مایوس ہونا خطرناک ہے اتنا ہی خود فریبی کی حد تک پرامید ہونا بھی نقصان دہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان حقیقت پسندی کی ایک وسیع وعریض دنیا آباد ہے۔ ہمیں اپنی اندرونی کمزوریوں کو ایمانداری کے ساتھ سمجھنے اور انہیں دور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اکیسویں صدی میں عظمت کے معیار مختلف ہیں اور 5 ہزار سال قدیم عظمتوں کو مزید کیش کرانا اب اتنا ہی دشوار ہے جتنا آنے والے برسوں میں پی پی پی کیلئے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اور بے نظیر کی قربانیوں کو کیش کرانا بے حد مشکل ہوگا۔ آج کی دنیا میں اقوام کی عظمت کیلئے بنیادی پیمانہ علم اور انسانی محنت (ذہنی اور جسمانی) ہے۔ سندھی سماج آج جس سیاسی، معاشی اور نفسیاتی دلدل میں پھنسا ہوا ہے اس سے نکلنے کیلئے ذیل میں وہ تجاویز دی جارہی ہیں جو میرے خیال میں ازبس ضروری ہیں۔

وڈیرانہ ذہنیت

سندھ کی مڈل کلاس کیلئے یہ ایک آسان نسخہ ہے کہ سندھ کی تمام بیماریوں وخرابیوں کا الزام وڈیرہ شاہی پر دھر دیا جائے اور خود کو تمام خامیوں سے بری الذمہ سمجھا جائے۔ بدقسمتی سے ہم اہل سندھ خود اپنی روزمرہ زندگی میں وڈیرانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں، مثلاً بغیر کام کاج کے باقاعدگی سے ماہانہ تنخواہ حاصل کرنا، تنقید برداشت نہ کرنا، بذریعہ شارٹ کٹ اپنا کیریئر بنانا، عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کیلئے حرام خوری کرنا، غیبت کرنا، دوسروں کی خامیوں کی تلاش میں رہنا،

قطار میں کھڑے ہونے کے بجائے بذریعہ سفارش اور رشوت اپنا کام کرانے کی کوشش کرنا' دوسروں کو حقیر اور کم تر سمجھنا جیسے ہمارے رویے اس امر کا ثبوت ہیں کہ آج سندھ کی مڈل کلاس وڈیروں سے کہیں بڑھ کر وڈیرانہ ذہنیت میں مبتلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سندھ کے درمیانہ درجے کے سیاسی رہنماؤں اور بیوروکریسی میں بدعنوانی اور بے ایمانی اپنی آخری انتہاؤں کو چھو رہی ہے۔ خصوصاً حکمران پارٹی میں شامل مڈل کلاس کے افراد جب حکومت کے ساتھ سال سوا سال گزار لیتے ہیں تو ان کی حرکتیں اور عادات واطوار وڈیروں سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے سندھ میں حد درجہ ابتری اور نفسانفسی کا ماحول بن گیا ہے۔

میرٹ کی عدم موجودگی

سندھی سماج کی ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ میرٹ کی عدم موجودگی اور پامالی ہے۔ نہ صرف تعلیمی اداروں میں داخلہ اور ملازمت کے حوالے سے' بلکہ ہم اپنی روزمرہ زندگی کے تمام امور میں میرٹ کے برعکس قدم اٹھاتے ہیں' جس کی وجہ سے آج سندھ میں کرپٹ ترین افراد بجائے قابل نفرت بننے کے قابل عزت بن گئے ہیں۔ اساتذہ اور طلبہ تنظیموں سے لے کر ادبی اداروں اور یونیورسٹیز کی سطح تک ہر جگہ اور ہر مقام پر دو نمبر' میرٹ شکن اور لاف زن بدعنوان افراد قابض نظر آتے ہیں۔ جو جتنا بڑا چور اور بے ایمان ہے وہ آج ہمارے ہاں اتنا ہی معزز اور معتبر گردانا جاتا ہے۔ اس کی علی الرغم ایماندار اور فرض شناس ہمارے آج کے سندھی معاشرے میں اجنبیت اور تنہائی کا شکار ہیں جس کی وجہ سے نسل نو کیلئے رول ماڈل بجائے مؤخر الذکر کے اول الذکر بدعنوان افراد بن گئے ہیں جو ایک بڑا المیہ ہے۔ آج ہمارے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے میرٹ کی پامالی کے باعث نااہل' کام چور اور بدعنوان افراد سے اٹے پڑے ہیں' جبکہ اہل' قابل' ایماندار اور دیانت دار افراد موجودہ سندھی معاشرے میں خود کو مس فٹ محسوس کرتے ہوئی کونوں کھدروں میں اپنا وقت گزارنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

مارکیٹ میں عدم موجودگی

سندھ کا مڈل کلاس ملازمت پیشہ طبقہ ہمہ وقت پروموشن' پوسٹنگ اور ٹرانسفر کیلئے سرگرداں اور مصروف رہتا ہے اور جب مذکورہ حوالے سے قدرے فرصت ملتی ہے تو ''اوپر کی کمائی'' کے حصول میں لگ جاتا ہے۔ صوبہ سندھ کے بڑے یا درمیانہ شہروں میں سندھی بطور بزنس مین کے ''آٹے میں نمک'' کے مصداق ہیں جبکہ سیاست پر سندھی وڈیروں کا قبضہ ہے۔ کاروباری یا صنعتی درمیانے طبقے کے' سندھ میں نہ ہونے کی وجہ سے سندھ کے سیاسی ڈھانچے کا مزاج بھی دیگر صوبوں سے یکسر مختلف ہے۔ سندھ میں دوسرے صوبوں کے مقابلے میں زیادہ سیاسی شعور کے دعوے کے باوجود ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی سندھی کتب کی اشاعت کے اداروں کیلئے کسی اپنی شائع کردہ کتاب کی ہزار جلدوں کی فروخت بھی بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ سندھ کی سرکاری یونیورسٹیز کا حال تو ابتر ہے ہی لیکن اس کے باوصف ماسوائے کراچی کے بقیہ سندھ میں ڈھنگ کے نجی تعلیمی ادارے بھی کہیں نظر نہیں آتے۔ سندھ میں ڈگری دینے والی 25 پرائیویٹ یونیورسٹیز میں سے 23 کراچی میں ہیں۔ دیہی سندھ میں آئی بی سے سکھر کے تعلیمی ادارے کے سوا کوئی اور بڑا قابل ذکر ادارہ نظر نہیں آتا جو سندھی نوجوانوں کو مسابقت کے اس دور میں موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق فنی اور ہنری تعلیم مہیا کر سکے' جس کی وجہ سے سندھ کے دیہی تعلیمی اداروں سے ڈگری کے حصول کے بعد سندھی نوجوان عملی میدان میں ذہنی انتشار' بدحواسی اور پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ دیہی سندھ کے جس دولت مند طبقے کے پاس روپیہ اور وسائل ہیں وہ پٹرول پمپ کھولنے اور شہروں میں پلاٹ خریدنے جیسے غیر پیداواری منافع بخش امور میں تو سرمایہ کاری کرتا ہے لیکن اعلیٰ اور معیاری تعلیم کے ادارے یا روزگار کی فراہمی کے کارخانے قائم کرنے میں اسے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے' حتیٰ کہ صوبہ سندھ کے سب سے بڑے شہر کراچی میں بھی سندھی افراد کاروباری مارکیٹ اور بزنس میں کسی اہمیت کے حامل نظر نہیں آتے۔

سندھ کی حقیقی نمائندہ تنظیم کی عدم موجودگی

سندھ اور بیرون سندھ ایک غلط فہمی طویل عرصے سے موجود ہے کہ پیپلز پارٹی سندھیوں کی ایک

نمائندہ تنظیم ہے۔ اگر نمائندگی کا مطلب صرف ووٹ کا حصول ہے تو یہ بات بڑی حد تک درست ہے لیکن اگر نمائندگی کا مقصد کسی قوم کے سیاسی اور سماجی حقوق کا تحفظ کرنا اور اس کے جذبات و احساسات کی عملی ترجمانی ہے تو یہ بات قطعی درست نہیں ہے کہ پی پی سندھیوں کی نمائندہ تنظیم ہے۔ درحقیقت سندھ کی پارلیمانی سیاست میں پی پی کی مدمقابل جماعتیں پی پی سے کہیں بڑھ کر خراب رہی ہیں جس کی وجہ سے اہل سندھ بہ امر مجبوری پی پی کو ووٹ دیتے رہے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر کی شہادت کے بعد سندھیوں کا پی پی سے جو ایک جذباتی تعلق تھا وہ بھی اب آخری دموں پر ہے' اور اب پی پی سندھی عوام کی چوائس ہرگز نہیں بلکہ ایک مجبوری بنی ہوئی ہے جبکہ سندھی قوم پرست تنظیمیں بھی تاحال اپنے آپ کو پی پی کے متبادل کے طور پر پیش کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ بدقسمتی سے پی پی اہل سندھ کی اس مجبوری کا غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے سندھ میں کوئی طویل المدتی بنیادی تبدیلی لانے کے بجائے اقتدار کی عارضی اور معمولی مفادات کیلئے اہل سندھ کے جذبات کا استحصال کرتی رہی ہے۔ آج سندھ میں گورننس حد درجہ خراب حالت میں ہے۔ ملازمتیں' تقرریاں' پروموشن' ٹرانسفر' ٹھیکے اور امداد سب حصول کمائی کا ذریعہ بن چکے ہیں۔ شہروں میں دہشت گردی اور دیہاتوں میں اغوا اور قتل کی وارداتیں معمولات زندگی کا حصہ بن گئی ہیں۔ سندھی عوام صرف زبانی وعدوں اور آسروں پر زندہ ہیں جبکہ ایک بڑی اکثریت کی حامل نمائندہ جماعت پی پی کے وابستگان کیلئے سندھ کمائی اور اقتدار کے حصول کا زینہ بنا ہوا ہے۔ محولہ بالا صورتحال میں اہل سندھ کسی حقیقی نمائندہ تنظیم کی کمی شدت سے محسوس کر رہے ہیں جو سندھیوں کو نفسیاتی بحران سے نکال کر انہیں ایک منظم قیادت فراہم کر سکے۔''

سندھ کی تقسیم کی خواہش اور زمینی حقائق

سندھ میں الگ صوبے کی حالیہ لہر کو محض آئندہ الیکشن میں ووٹ حاصل کرنے کی سیاسی چالاکی تک محدود نہیں سمجھنا چاہیے۔ میری رائے میں 2014ء میں افغانستان سے ناٹو افواج کی واپسی سے قبل اس خطے میں اہم فیصلے ہونے کی توقع ہے۔ امریکہ اور اس کے اتحادی، بحر ہند اور جنوبی چینی سمندر میں اپنی فوجی قوت کو مزید مضبوط کرنے پر بھی توجہ دیں گے اور اس معاملے میں چین اور بھارت سے ان کے تعلقات بھی نئی نہج پر استوار ہوں گے۔ امریکہ، چین اور بھارت اس خطے میں اپنی فوجی اور معاشی قوت کو مضبوط کرنے کی دوڑ میں ایک سرد جنگ کی شروعات کر چکے ہیں۔ اس پس منظر میں ملک کے چاروں صوبوں میں نئے صوبے بنانے کی ایک ہی وقت میں تیز ہونے والی حالیہ مہم کسی نہ کسی طور سے بہرحال مذکورہ سرد جنگ سے ہی وابستہ ہے اور پیپلز پارٹی کی حکومت اس سارے کھیل میں شعوری طور پر ملوث ہے جس کے لیے میرے پاس حسب ذیل دلائل ہیں۔

سرائیکی صوبے کے قیام کے لیے اٹھارھویں آئینی ترمیم کی طرح سب کی شراکت اور رضامندی پر مبنی سیاسی راستہ اختیار کرنے کی بجائے پی پی کی حکومت نے مہم جوئی کا راستہ اپنایا اور آئینی تقاضوں کو پامال کرتے ہوئے نئے صوبوں کے قیام کے لیے شارٹ کٹ اپناتے ہوئے قومی اسمبلی میں قرارداد پیش کر دی، جس کی وجہ سے پی پی نے دوسرے حلقوں کو بھی نئے صوبے بنانے کے حوالے سے بجائے آئینی اور قانونی طریقہ اپنانے کے، مہم جوئی پر مبنی طریقہ اختیار کرنے کا

راستہ دے دیا ہے۔

قومی اسمبلی میں ایم کیو ایم کو ایک ایسا بل لانے کی اجازت دی گئی جو ظاہراً اٹھارھویں آئینی ترمیم کی روح کے یکسر برعکس ہے۔ اس بل کے مطابق، قومی اسمبلی براہِ راست صوبوں کی تقسیم کے اختیارات اپنے پاس رکھ سکتی ہے جس کا کوئی بھی اصولی اور اخلاقی جواز نظر نہیں آتا۔ اس بل میں واضح طور پر اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ صوبوں کی سرحدیں مقدس نہیں ہیں۔ ایک طرف مذکورہ عوام دشمنی پر مبنی بل قومی اسمبلی میں پیش کرنے کی اجازت دی گئی تو دوسری جانب سندھ اسمبلی میں مسرور جتوئی کی پیش کردہ قرارداد کو کمیٹی کے سرد خانے میں پھینک دیا گیا۔ یہ دوسرا اور مبنی بر تضاد معیار صاف طور پر اس بات کا اظہار ہے کہ پی پی حکومت شعوری طور پر اس ساری کارروائی میں شامل ہے۔

گزشتہ برس نصف شب کو سندھ میں دو انتظامی ڈھانچے قائم کرنے کا اعلان کر کے پیپلز پارٹی نے عملی طور پر سندھ کی تقسیم کی ابتدا کر دی تھی اور یاد رہے کہ اس وقت دورانِ اعلان وزیر اعلیٰ سندھ بھی موقع پر موجود تھے، اس لیے پی پی پی محض بابر اعوان کو اس کا ذمہ دار قرار دے کر اہل سندھ کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتی۔

مہاجر صوبے کی مہم شروع ہونے کے بعد وال چاکنگ، بل بورڈ اور بینر سندھ کے کئی شہروں میں آویزاں رہے مگر کئی ہفتے گزرنے کے باوجود پی پی حکومت اس حوالے سے آنکھیں بند کر کے بیٹھی رہی اور انہیں ہٹانے کا حکم تب جاری کیا گیا جب یہ مہم اپنی جڑیں مضبوط کر چکی تھی اور اس کا نتیجہ ''محبت سندھ'' کی پُر امن ریلی پر دہشت گردوں کے حملے اور 14 شہادتوں کی صورت میں برآمد ہوا۔ پی پی حکومت کا مجرمانہ تجاہل عارفانہ اس ساری مہم اور خوں ریزی کا باعث بنا۔ سندھ کو تقسیم کرنے کی اس ساری مہم کی ذمہ داری پی پی کی اتحادی جماعت ایم کیو ایم پر عائد ہوتی ہے۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ آخر ایم کیو ایم، سندھ کے باشندوں کو اتنا لاعلم اور نادان کیوں سمجھتی ہے؟ ایک طرف تو وہ سندھ کی تقسیم کے خلاف اعلان کرتی ہے، دوسری جانب اس کے ذمہ دارانہ اور

رہنمائی وی چینلوں پر دن رات الگ صوبے کی مہم کا ہر طرح سے دفاع کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس مہم کو آئینی حق اور عوامی جذبات کا آئینہ قرار دیتے ہوئے ایم کیو ایم کے رہنما اس حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اس مہم کی وجہ سے کسی ممکنہ بڑی خوں ریزی کو باجواز بھی ثابت کرنے لگ جاتے ہیں۔ ایم کیو ایم کے ایک سینئر رہنما نے ایک ٹی وی انٹرویو میں کہا کہ خوں ریزی تو قیامِ پاکستان کے وقت بھی ہوئی تھی۔ اب یہ امر بلاشبہ واضح ہو گیا ہے کہ مہاجر صوبے کی تحریک دراصل ایم کیو ایم کی فیکٹری ہی کی پراڈکٹ ہے، کیوں کہ وہ تو اس مہم کی واضح اور کھلے الفاظ میں مخالفت یا مذمت تک کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔ پرانی تنظیمیں بحال کر کے سندھ کی تقسیم کی مہم چلانے والے افراد، کراچی میں ایم کیو ایم کی رضامندی کے بغیر بھلا کیوں کر اور کس طرح یہ کام کر سکتے ہیں؟ یہ ناممکن ہے۔ ایم کیو ایم ایک عرصے سے یہ کہہ رہی ہے کہ وہ سندھ میں تمام سندھیوں سے بہتر تعلقات چاہتی ہے اور یہ کہ اردو بولنے والے بھی خود کو سندھی سمجھتے ہیں۔ سندھ ان کا وطن ہے اور سندھیوں نے بھی اس کا ہمیشہ مثبت جواب خوش دلی سے دیا ہے۔ مگر اس کے باوصف ایم کیو ایم کا کئی معاملات پر عملی رویہ ان کے کہے کے برعکس ہی رہا ہے۔ گزشتہ برس سندھ کو دو انتظامی ڈھانچوں میں تقسیم کرنے کے اعلان کے موقع پر اس کے گورنر عشرت العباد بھی موجود تھے۔ سندھ کی تقسیم کی حالیہ مہم کے حوالے سے اس کی مبنی بر تضاد پالیسی اور انداز اُن اہل سندھ کے اذہان میں متعدد سوالات ابھار رہے ہیں جو اُردو بولنے والوں کو اب سندھ کے مستقل باشندے اور سندھ کی وراثت اور ملکیت کا حق دار گردانتے ہیں۔ دو کشتیوں میں سوار ہونے کی اس سیاسی غیر دانش مندی کا نتیجہ اُردو اور سندھی بولنے والی آبادی دونوں کے لیے اچھا برآمد نہیں ہوگا اور یہ نتیجہ سندھ میں ایک خوف ناک لسانی کشیدگی کی صورت میں نکل سکتا ہے جو سندھ کے کسی بھی باشندے کے حق میں بہتر ثابت نہیں ہوگا۔

اس سارے پس منظر میں اس بات کا اعادہ کرنا ضروری ہے کہ کراچی کی قسمت کا اصل فیصلہ عالمی طاقتیں، پیپلز پارٹی یا ایم کیو ایم نہیں بلکہ اہل سندھ کا سیاسی ردِعمل کرے گا۔ سارے سندھ میں ایک بھی سندھی ایسا نہیں ہے جو سندھ کی تقسیم کو قبول کرنا تو کجا، اس کا تصور بھی کر سکے۔ اسی طرح

اُردو اور دوسری زبانیں بولنے والے لاکھوں اہل سندھ، تقسیم سندھ کے سخت مخالف ہیں اور وہ اسے سندھ میں خوں ریزی برپا کرنے کی ایک خطرناک سازش گردانتے ہیں۔ لہٰذا تقسیم سندھ کے خواہش مند حلقوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ انہوں نے ایک ایسے کام میں ہاتھ ڈالا ہے جس کو نہ صرف پایۂ تکمیل تک پہنچنا ناممکنات میں سے ہے بلکہ ان کا یہ مؤقف ان کے مستقبل کو بھی برباد کر سکتا ہے۔ میری رائے کے مطابق سندھ کے قوم پرست حلقوں کو اس مہم کو روکنے کے لیے مندرجہ ذیل طریقے استعمال کرنے چاہئیں۔

کسی بھی قیمت پر سندھ میں لسانی تصادم ہونے سے روکا جائے۔ تقسیم سندھ کے آرزومند حلقے اس امر سے بہ خوبی آگاہ ہیں کہ آئینی طریقے سے صوبے کی تقسیم ممکن نہیں ہے، اس لیے وہ ہر ممکن سعی کریں گے کہ سندھ میں آباد کروڑوں اردو اور سندھی بولنے والے پُرامن لوگوں کے مابین تصادم کی کیفیت جنم لے اور اسی نوع کی کوشش کراچی میں محبت سندھ ریلی پر حملے کی صورت میں بھی کی گئی اور اہل سندھ نے اپنے روایتی شعور کا مظاہرہ کرتے ہوئے دہشت گردی کے اس عمل کو لسانی خوں ریزی میں تبدیل نہیں ہونے دیا۔ سندھ میں آباد اردو بولنے والی آبادی کے متعدد مؤثر اور معتبر حلقے الگ صوبے کی مہم کو واضح الفاظ میں رد کر چکے ہیں اور اس کی مخالفت میں مصروف ہیں۔ ایسے تمام سندھ دوست افراد سے روابط رکھے جائیں اور اردو بولنے والی آبادی کی ایسی شخصیات کو سندھ کا جغرافیہ برقرار رکھنے والی سندھ دوست مہم کا حصہ بنایا جائے۔

شہروں اور دیہاتوں میں عوامی بیداری کے ذریعے پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم پر یہ دباؤ ڈالا جائے کہ وہ سندھ کے جغرافیہ کے حوالے سے اپنے قول و فعل کے تضادات کو ختم کریں۔ اگر یہ حلقے کسی عالمی ایجنڈے کی تکمیل کے لیے سندھ کی تقسیم کے حوالے سے کسی منصوبے پر عمل پیرا ہیں تو پھر انہیں عوام کے سامنے اپنا اصل چہرہ پیش کرنا چاہیے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں سندھ میں ہونے والے کسی بھی نقصان کی یا کل کلاں ہونے والے کسی انسانی المیے کی ساری ذمہ داری بھی مذکورہ دونوں حلقوں ہی پر عائد ہوگی۔ پیپلز پارٹی بھلے سے عوام کو یہ لطیفے سناتی رہے کہ اس مہم کے پس پردہ

نواز شریف کا ہاتھ ہے مگر اہل سندھ ہرگز اتنے سادہ لوح اور لاعلم نہیں ہیں جتنا کہ ایم کیو ایم اور پی پی انہیں سمجھتے ہیں۔ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم میں موجود سمجھ دار اور سندھ دوست ہونے کے دعوے دار رہنماؤں اور اسمبلی ممبران کو بھی اپنی قیادت سے برملا یہ سوال کرنا چاہیے کہ اصل حقائق اور سچ ہے کیا؟ اور عدم اطمینان کی صورت میں انہیں پارٹی اور سندھ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا چاہیے، بصورتِ دیگر اہل سندھ انہیں بھی تقسیم سندھ کی سازش میں حصہ دار ہونے کا ذمہ دار گردانے پر مجبور ہوں گے۔

کراچی تاریخی طور پر سندھی باشندوں کا شہر ہے، اس لیے روزگار، رہائش، کاروبار اور ثقافتی سرگرمیوں میں انہیں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔ سندھ کی علمی، ادبی اور ثقافتی تنظیموں کو بھی کراچی میں اپنی سرگرمیاں پہلے سے زیادہ بڑھانی چاہئیں اور کراچی میں ہر زبان بولنے والے طبقے کو اپنی سرگرمیوں میں شامل کرنا چاہیے۔ سندھی ثقافت کو کراچی کی شناخت بنانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ سندھ کی تمام سیاسی جماعتوں کو بھی کراچی میں ہی اپنے مراکز تشکیل دینے چاہیں اور ان کی قیادت کو بھی اپنا وقت کراچی میں گزارنا چاہیے اور اس امر پر ان کی توجہ مرتکز رہنی چاہیے کہ سندھی کے ساتھ ساتھ دیگر زبانیں بولنے والی برادریوں کو تقسیم سندھ کے خلاف متحرک کیا جائے اور سیاسی حوالے سے بھی دہشت گردی کے ہاتھوں ستائے گئے عوام کی مدد کی جائے اور خصوصاً قوم پرست تنظیموں کو اپنا مرکز کراچی ہی میں بنانا چاہیے۔ ایک مخصوص دہشت گرد ٹولہ جو زبان اور قومیت کی شناخت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا، سارے کراچی کو یرغمال بنائے ہوئے ہے اور اس کے لیے اہل کراچی کو احساسِ تحفظ دینا چاہیے تاکہ وہ خود کو بے سہارا نہ سمجھیں۔ دہشت گردی کے شکار افراد چاہے وہ کسی بھی قومیت کے حامل اور کوئی بھی زبان بولنے والے ہوں، انہیں سندھ کی وحدت کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہیے۔ سندھ کی قوم پرست جماعتوں کو چاہیے کہ وہ منتشر ہو کر جدوجہد کرنے کی بجائے سندھ کی جغرافیائی وحدت جیسے غیر معمولی اہمیت کے حامل ایشو پر مشترکہ جدوجہد کریں تاکہ ان کی آواز اور کوشش میں اثر اور قوت دکھائی دے اور سندھی قوم پرست جماعتوں کو ''سپنا'' کے پلیٹ فارم سے تقسیم سندھ کی سازش کے

خلاف کراچی میں ایک رابطہ سیکریٹریٹ کا قیام بھی عمل میں لانا چاہیے کیوں کہ ماضی قریب میں ''سپنا'' ایسے معاملات کے حوالے سے نہایت اہم کردار ادا کرتا رہا ہے اور اب بھی اسے مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔ نہ صرف سندھ میں، بلکہ ملکی سطح پر اس رائے عامہ کو ہموار کرنا چاہیے کہ سندھ کی تقسیم کے خواہش مند حلقے دراصل پاکستان توڑنے کی خواہش رکھنے والی غیر ملکی طاقتوں کے ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں اور ملکی سطح کی ایک ایسی جدوجہد کے ذریعے سے تقسیم سندھ کی سازش کی مرتکب طاقتوں کو اکیلا کرنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ نسلی بنیادوں پر تحریکیں قائم کر کے سندھ کی تقسیم کا مطالبہ کرنے والے افراد کا کردار بے حد مشکوک ہے۔ اتنی بڑی مہم کی اچانک شروعات کے پس پردہ بلاشبہ وہ طاقتیں ہیں جو پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس خطے میں اپنے عسکری، سیاسی اور معاشی مفادات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

سندھ کے سیاسی حلقوں اور سول سوسائٹی کو چاہیے کہ اقوامِ متحدہ اور اُن ممالک کے سفارت کاروں سے رابطہ کر کے انہیں بتائیں کہ ان کی طرف سے تقسیم سندھ کی کوئی بھی کوشش کرنے والے حلقوں کی سرپرستی کا تاثر سندھی عوام میں قبولِ عام کا درجہ حاصل کر رہا ہے، اس لیے خطے میں پائیدار امن کے لیے ایسی کسی بھی سوچ سے اُنہیں احتراز کرنا چاہیے۔ اس خطے میں ان کے کوئی بھی مفادات سندھی عوام کو ناراض کرنے کی صورت میں پورے نہیں ہوسکیں گے۔ کراچی، اہل سندھ کے لیے محض ایک جذباتی نہیں بلکہ اصولی معاملہ ہے، اس لیے وہ جمہوریت کے نام پر کسی بھی ایسی آئین سازی اور قانون سازی کو تسلیم نہیں کریں گے جو ان کے تاریخی وطن (سندھ) کو ٹکڑے کرنے کی بنیاد اور دلیل فراہم کرے۔ اہل سندھ کا جمہوریت اور پی پی پی سے محبت اور احترام کا رشتہ سندھ سے وابستہ ہے اور جب ان کی دھرتی، ثقافت اور قومی وجود کے لیے جمہوریت اور پیپلز پارٹی سوالات ابھارنے کا باعث ثابت ہوں گی تو اہل سندھ انہیں بھرپور طاقت کے ساتھ جواب دیں گے۔

ذوالفقار آباد۔ اشرافیہ کے لیے اشرافیہ کا منصوبہ

28 جنوری 2011ء کو صدر کی سربراہی میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں بتایا گیا کہ منصوبے کے لیے ضلع ٹھٹھہ کے چار ساحلی تعلقہ جات میں 1.6 ملین ایکڑ زمین درکار ہوگی۔ نشان زدہ زمین کا 1.2 ملین ایکڑ سے زیادہ رقبہ فی الوقت زیر سمندر ہے۔ بورڈ آف ریونیو کی جانب سے پیش کردہ معلومات کے مطابق شہر کے لیے 1.3 ملین ایکڑ زمین استعمال میں لائی جاسکتی ہے، جس کا 0.96 ملین ایکڑ قابل طب ہے اور 0.36 ملین ایکڑ حصہ فی الفور دستیاب ہے۔

منصوبے کی خاطر زمین حاصل کرنے کے لیے حکومت سندھ کی جانب سے سندھ لینڈ مینجمنٹ اینڈ ڈویلپمنٹ کمپنی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ کمپنی نے 200,000 ایکڑ زمین پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے اسے غیر قانونی مقبوضات قرار دینے میں قطعی تاخیر نہیں کی۔ اس اقدام پر مقامی مچھیروں کی کمیونٹی نے احتجاج کیا، جو اپنے آباؤ اجداد کے وقت سے ان علاقوں میں رہائش پذیر ہیں۔ سول سوسائٹی اور سیاسی تنظیموں نے غریبوں کی حمایت کی ہے۔

طریقہ کار کی خلاف ورزی

منصوبے کو عملی روپ دینے کے لیے حکومت سندھ کی جانب سے 2010ء میں ZDA ایکٹ کے تحت ایک خودمختار ذوالفقار آباد ڈویلپمنٹ اتھارٹی (ZDA) کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔
اخباری اطلاعات کے مطابق، اتھارٹی صوبائی محکمہ برائے منصوبہ بندی اور ڈویلپمنٹ سے منظوری

حاصل کیے بغیر منصوبے کے تحت کوئی بھی سکیم منظور کرنے کی طاقت سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔ اتھارٹی کی ایک اعلیٰ اختیاراتی ایگزیکٹو کمیٹی کو تمام تر فیصلوں کا اختیار دیا گیا ہے۔ صوبے کے چیف سیکرٹری اتھارٹی کے رسمی رکن ہوں گے، رسمی سربراہی وزیراعلیٰ کے پاس ہوگی جب کہ عملی سربراہ منیجنگ ڈائریکٹر ہوگا، جو فی الوقت ایک ریٹائرڈ ملازم ہے۔ یہ سازشی ادارہ جاتی صورتِ حال منصوبے کو شروع کرنے کے لیے حکومت کی جانب سے ناشائستہ عجلت کی عکاس ہے۔ اس منصوبے کے لیے دکھائی دی جانے والی پھرتی میں، حکومت پاکستان منصوبہ بندی کمیشن کی منصوبوں کے لیے انتظامی راہنما اصولوں کو بھی نظر انداز کر چکی ہے۔ ان راہنما اصولوں کے مطابق 500 ملین روپے سے زیادہ لاگت کے کسی بھی منصوبے کو ECNEC کی اجازت درکار ہوتی ہے۔ تاہم تاحال اس منصوبے کو ECNEC کے سامنے منظوری کے لیے پیش نہیں کیا گیا ہے۔

تاحال پیش امکان (PC-III)، امکان (PC-II) اور منصوبے کی دستاویزات (PC-I) میں سے کوئی بھی ایسی چیز دستیاب نہیں ہے جو منصوبے کی تکنیکی اور دیگر تفصیلات بیان کرے۔ ہر پبلک سیکٹر یا پبلک۔ پرائیویٹ اشتراک کے منصوبے کے لیے ان دستاویزات کی موجودگی لازمی ہوتی ہے، بہ صورتِ دیگر منصوبے کو غیر قانونی یا خلافِ ضابطہ قرار دیا جاتا ہے۔

مقامی آبادیوں کے حقوق

عالمی پیمانے پر ساحلی پٹی کو تجارتی سرمایہ کاری، مثلاً رہائش، سیاحت، صنعت اور تجارت کے لیے پُرکشش مقام تصور کیا جاتا ہے۔ انتہائی مہنگے رہائشی منصوبے ساحلی قصبوں اور شہروں کے ساتھ قائم کیے گئے ہیں۔ کچھ تخمینوں کے مطابق اندازاً زمین پر تین بلین افراد ساحل کے 200 کلومیٹر علاقے میں رہائش پذیر ہیں جب کہ دنیا کے 17 میں سے 14 بڑے شہر ساحلی پٹی پر واقع ہیں۔ یہ ترقی اکثر مقامی آبادیوں کی قیمت پر عملی روپ دھارتی ہے۔ اس پس منظر میں سول سوسائٹی نے اس منصوبے کی سماجی و ماحولیاتی مضمرات پر سنجیدہ خدشات کا اظہار کیا ہے۔ یہ ظاہر ساحلی دیہاتوں سے ہزاروں افراد کی غیر رضاکارانہ منتقلی کی منصوبہ بندی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

پانی کی ضرورت

دس افراد کی آبادی کے حامل شہر کو بھی مناسب پانی کی ضرورت ہوگی۔ کراچی شہر کا تجربہ ہمیں سکھاتا ہے کہ اس حیات بخش سہولت کی کارکردگی اور ساکھ کے ذمہ دار ادارے ہوتے ہیں۔ پانی کی کھپت کے معیارات کے مطابق 16 ملین رہائشی افراد کے حامل شہر کو روزانہ تقریباً 600 ملین گیلن پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کراچی شہر کی آبادی کے غلط امداد و شمار اس مقدار کے 1000 مین گیلن روزانہ تک کا مطالبہ کرتے ہیں۔ صنعتوں کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے مزید 123 ملین گیلن روزانہ پانی کی ضرورت ہے۔ اس قلت کے باعث کراچی شہر میں پینے کے پانی کی طلب و رسد کے درمیان فاصلے کو گھٹانے کے لیے K-IV منصوبے کا آغاز کیا گیا ہے۔ یہ دریائے سندھ میں سے 1200 کیوسک اضافی پانی کا رخ تبدیل کرے گا جس کا نتیجہ ٹھٹھہ کی 300,000 ایکڑ زرعی زمین کے متاثر ہونے کی صورت میں نکل سکتا ہے (روزنامہ ڈان: 25 مئی 2012ء)۔ دریائے سندھ کی انتظامی اتھارٹی، ارسا (IRSA) کراچی کے لیے پانی کی اس رسد کو تربیلا ڈیم سے پوری کرنے کے لیے پہلے ہی انکار کر چکی ہے۔ اس شہر کو چھوٹا پاکستان قرار دیا جاتا ہے لیکن جب پانی کی ضرورت کا مرحلہ آتا ہے تو صوبہ سندھ سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے حصے کے پانی کی قربانی دے۔

حکومت سندھ اور ایشیائی ترقیاتی بینک کے سندھ کے ساحلی علاقوں کے ترقیاتی منصوبے کے تحت کیے جانے والے ''ساحلی علاقوں کے بیس لائن سروے'' کے مطابق، یہ چار تعلقے 0.14 ملین ایکڑ سے زیادہ زمین پر بہت سی فصلیں، سبزیاں اور پھل اُگاتے ہیں۔ شہر سے پانی کا رُخ موڑنے کی صورت میں زرعی زمینیں آب پاشی کے بغیر رہ جائیں گی جس کے نتیجے میں آبادیاں اپنے ذریعہ معاش سے محروم ہو جائیں گی۔ کراچی کے تجربے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹینکر مافیا کو اپنے کاروبار کا نیا سود بخش مرکز تجارت سے میسر آجائے گا۔ اس پانی کی قیمت کون ادا کرے گا؟ ظاہر ہے کہ غریب مقامی آبادیاں۔

ماحولیاتی مسائل

دریائے سندھ پاکستان کے ماحولیاتی ورثے کے تاج کا قیمتی ہیرا ہے۔ اس کے زرخیز حیاتیاتی تنوع کے لیے، ڈیلٹا کو رامسر علاقہ قرار دیا گیا ہے بڑے پیمانے پر ماحولیاتی اہمیت کا حامل ہے۔ تازہ پانی کے بہاؤ میں کمی کے باعث انڈس ڈیلٹا پہلے ہی متاثر ہوا ہے جس کا نتیجہ سمندری مداخلت کی صورت میں نکلا ہے۔ مذکورہ چار تعلقے ڈیلٹا کے انتہائی متاثرہ علاقوں میں واقع ہیں۔ ذوالفقار آباد منصوبے کے حامی شور مچاتے ہیں کہ مدوجزر والے علاقوں میں زمین پر دوبارہ قبضے کے ذریعے سمندری مداخلت کو روکا جائے گا اور یوں زمین سمندر کی مزید مداخلت سے محفوظ ہوگی۔ اگر حکومت علاقے کی زمین کو محفوظ کرنا چاہتی ہے تو ایک مناسب تعمیر کردہ بند اس ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔ نئے شہر کی صورت میں ہوسکتا ہے کہ زمین محفوظ ہو سکے لیکن مقامی غریب آبادیوں کے لیے فائدہ مند نہیں ہوگی۔ دستیاب زمین نجی شعبے کے سرمایہ کاروں کے لیے پُرکشش ثابت ہوگی۔ WWF پاکستان کی ایک دستاویز کے مطابق، وہ علاقہ جہاں شہر کے قیام کی تجویز ہے، ملک کے بقیہ مینگرو سے ڈھکے علاقوں کا تقریباً 50 فیصد ہے جن میں سے اکثریت کو 1950ء کی دہائی سے محفوظ قرار دیا گیا ہے۔ مذکورہ مقام کی زمین کے موجودہ ہیئت کے حوالے سے حالیہ تحقیقات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ بہت سے بڑے اور چھوٹے خلیجوں میں مینگرو جنگلات، مرطوب دلدلوں اور سمندری پانی سے علاقے کے کل رقبے کا بالترتیب 7.2، 40.2 اور 20 فیصد حصہ ڈھکا ہوا ہے (WWF پاکستان)۔ بقیہ ایک تہائی حصہ اندرونی علاقہ ہے جو تقریباً 9 فیصد حصے پر زراعت اور دیسی سبزیوں اور ذوالفقار آباد کے مجوزہ کل رقبے میں سے 24 فیصد غیر آباد زرعی زمین اور رہائشی علاقوں پر مشتمل ہے۔ مجوزہ رقبے کی 135000 ایکڑ سے زیادہ زمین مینگرو جنگلات سے ڈھکی ہوئی ہے۔ ان جنگلات کا تقریباً نصف حصہ محفوظ علاقے میں واقع ہے جو سندھ محکمہ جنگلات کے انتظامی دائرہ اختیار میں آتا ہے، لیکن کسی بھی مرحلے پر محکمے سے مشاورت نہیں کی گئی ہے۔ اسی طرح اس نوعیت کے منصوبے کے لیے پاکستانی ایکٹ برائے تحفظِ ماحولیات کے تحت ایک ماحولیاتی اثرات کے جائزے کی ضرورت ہوتی ہے (جس کا ایک جز سماجی اثرات کا جائزہ ہے)۔

منصوبے کی وسعت کے پیشِ نظر مثالی طور پر حکمتِ عملی کے اثرات کا جائزہ بھی لینا چاہیے۔ تاہم ان تمام لوازمات کی برملا خلاف ورزی ہوئی ہے۔

قدرتی آفات کی زَد میں

سمندری علاقوں کو اب مزید صحت بخش مقامات تصور نہیں کیا جاتا۔ ماحولیاتی خطرات اور ساحلی آفات نے ایسے شہروں کو مزید خطرناک بنا دیا ہے۔ 2004ء میں مشرقی ایشیائی ساحل اور 2011ء میں جاپان کے سونامی ساحلی شہروں پر منڈلاتے خطرات اس کے واضح شواہد فراہم کرتے ہیں۔ سیاحت، صنعت، جہازی اور آبی ثقافت کے شعبے سرمایہ کاروں کی دل چسپی کا محور ہیں۔ قدرتی ماحولیاتی نظام ان علاقوں میں بہ تدریج بگڑ رہا ہے اور آخر کار ٹھوس اور سخت ہو چکا ہے۔ مشرقی ایشیائی ممالک سے ٹکرانے والے سونامی نے وسیع پٹی پر مینگرو جنگلات کا خاتمہ کر کے 9 بلین ڈالر کی جھینگا صنعت تشکیل دی ہے۔ 2001ء کے سونامی کے نتیجے میں ہونے والی وسیع و عریض تباہی کے باعث وہ تمام معیشت، جس کا دعویٰ ان ممالک کی جھینگا صنعت کرتی تھی، ڈھ گئی۔ مینگرو جنگلات سونامی کے اثرات میں کمی لا سکتے تھے۔ کچھ اطلاعات کے مطابق، سندھ کا ساحل ایک صدی میں اوسط چار طوفانوں کا سامنا کرتا تھا، تاہم اس کی کثرت اور شدت میں کئی طرح کے اضافے ہوئے ہیں اور 1971ء سے 2001ء کے عرصے میں 14 طوفان ریکارڈ کیے گئے۔ 2001ء سے 2010ء کے درمیان دو انتہائی شدت کے طوفان آئے، جیسے یمین طوفان اور فیٹ طوفان سندھ کے ساحل کے بے حد قریب سے گزرے۔ چناں چہ ذوالفقار آباد کو سنجیدہ خطرات لاحق ہوں گے۔ کراچی کا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ ساحلی علاقوں میں شہری ترقی مینگرو جنگلات اور ساحلی ماحولیات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتی ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں میں کراچی کا ساحل اپنے قیمتی مینگرو درختوں کا بیشتر حصہ ضائع کر چکا ہے۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ، پورٹ قاسم اتھارٹی اور سندھ محکمہ جنگلات اپنے تمام تر بلند و بانگ دعووں کے باوجود مینگرو کے وسیع کٹاؤ کو روکنے میں ناکام رہے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق، سندھ ڈیلٹا میں مینگرو کے خاتمے کی شرح 2.3 فیصد سالانہ ہے، جو ماحولیاتی تباہی ہے۔

ذوالفقار آباد مینگرو درختوں کی چھاؤں ختم کر کے ان علاقوں میں ساحلی تباہی کے خطرات کو مزید بڑھاوا دیتا ہوا نظر آتا ہے۔

نئے شہر کے لیے منتخب کردہ زلزلوں کا فعال علاقہ ہے۔ زلزلے کے باعث ہونے والی صدیوں پرانی تباہیوں کے اثرات موجود ہیں۔ کچھ مورخین کے مطابق 893 عیسوی میں آنے والے ایک زلزلے نے سندھ ڈیلٹا میں دیبل کا تاریخی مقام برباد کر دیا تھا۔ مجوزہ شہر اللہ بند فالٹ کے نزدیک زلزلے کے فعال علاقے پر واقع ہے، جسے شدید زلزلے کا ممکنہ خطرہ لاحق ہے۔ اس کے جنوب مشرق میں گجرات کا زلزلے والا علاقہ (GSZ) اور شمال مغرب میں مکران کا زیریں علاقہ (MSZ) واقع ہے جس سے مجوزہ شہر کو سنجیدہ خطرات ہیں۔ اس کی سرحد کے ساتھ ملحق علاقوں میں 2001ء کا بھوج زلزلہ تباہی کا باعث بنا تھا۔ اس شدید زلزلے میں 18500 لوگ مارے گئے تھے۔ یہ زلزلہ کراچی میں بھی محسوس کیا گیا تھا جہاں چند عمارات میں دراڑ پڑ گئی۔ بدین اور تھرپارکر کے ضلعوں میں بھی اس کی شدت محسوس کی گئی اور نقصان پہنچا۔

لہٰذا ذوالفقار آباد کو زلزلہ محفوظ ڈھانچے پر قائم کرنے کے لیے بے انتہا وسائل درکار ہوں گے جب کہ 150 کلومیٹر دور واقع کراچی میں بھی زلزلے کے جھٹکے محسوس کیے جاتے ہیں۔

غلط ترجیحات

سندھ میں غیر منظم ڈھانچے اور غیر معیاری سہولیات کو دیکھتے ہوئے، کسی بھی شخص کو اچنبھا ہو سکتا ہے کہ ان وسائل کو صوبے میں پہلے سے موجودہ ڈھانچوں اور سہولیات کو بہتر بنانے میں کیوں نہیں لگایا جا سکتا۔ صوبے کا بڑا حصہ گاڑیوں کے لیے شاہ راہوں، مربوط سڑکوں اور ثانوی شہروں میں بنیادی ڈھانچے سے محروم ہے۔ سندھ کے بڑے شہروں اور ثانوی قصبوں میں رہائش، پینے کا پانی اور حفظانِ صحت کی سہولیات موجود نہیں ہیں۔ ہزاروں سکول اور صحت کے مراکز بنیادی سہولیات

سے محروم ہیں لیکن حکومت نے تیزی سے بگڑتے ہوئے ڈھانچوں اور سہولیات کو نظر انداز کیا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر، سرکاری اعداد و شمار کے مطابق سندھ میں 10722 سکول عمارات کے بغیر 24559 سکول پینے کے پانی کی سہولت کے بغیر موجود ہیں (سندھ معاشی سروے 2009-2011ء)۔ یہی دستاویز کہتی ہے کہ ''سندھ میں صحت کی سہولیات کی فراہمی واضح طور پر ناکافی ہے''۔ صوبے کے پاس ہر 10000 افراد کے لیے صرف 3.5 ڈاکٹر اور 1.1 نرسیں ہیں۔ 2010ء اور 2011ء کے آخری دو سیلابوں کے دوران، سندھ کو انتہائی نقصان کا سامنا ہوا۔ تقریباً 50000 گاؤں متاثر ہوئے جب کہ اندازاً 2.5 ملین گھروں کو نقصان پہنچا۔ 2010ء کے سیلابوں کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات کے جائزے کے مطابق، عوامی و نجی ڈھانچوں کو پہنچنے والے نقصان کی مالیت 372 بلین روپے ہے۔ 2011ء کے سیلاب پہنچنے والا نقصان بھی اس سے کم نہیں۔ صوبائی حکومت کے پاس متاثرہ ڈھانچے کی مرمت کے لیے رقم ناکافی ہے۔ کراچی سے آبادی کا دباؤ کم کرنے کے لیے مزید دانش مند حکمتِ عملیوں کی ضرورت ہے۔ سندھ میں دیہی، شہری ہجرت درحقیقت غربت میں اضافے، زمینوں پر دباؤ اور پانی کے وسائل جیسے مسائل کا سبب ہے جب کہ دیہی علاقوں میں امن و امان کی صورت حال دیہی آبادی کو زندگی کے بہتر مواقع کے حصول کے لیے شہری علاقوں میں ہجرت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس منظرنامے میں ذوالفقار آباد ایک غلط ترجیح ہے جس کا حاصل دور اندیشی سے خالی میگا سٹی بنانے میں لاکھوں ڈالرز جھونکنے کے سوا کچھ نہیں۔

سندھیوں کی گردن میں پڑنے والا نیا طوق

''مکانی اداروں کے دو نظام اور صوبے کی تقسیم کے معاملے سے ابھی سندھ کو نجات نہیں مل سکی تھی کہ حکومت نے سندھ میں ذوالفقار آباد کی تعمیر کا کام فوری طور پر شروع کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ 2009ء میں جھرک شہر کے نام سے شروع اس منصوبے کو ذوالفقار آباد کا نام دے کر اسے شہید بھٹو کی سوچ اور فکر سے وابستہ شہر قرار دیا گیا۔ اپنے دور اقتدار کے آخری برس پیپلز پارٹی نے اہلِ سندھ کی گردن میں ایک نیا طوق ڈالنے کے لیے اس پر کام کی رفتار بھی تیز کر دی ہے اور سندھ کابینہ نے اس سکیم کو منظور بھی کر ڈالا ہے۔ سندھ کابینہ کے کسی وزیر کو بھی اس سکیم کی تفصیلات کا علم نہیں ہے۔ اہل سندھ کو سکیم کے سود و زیاں کا کچھ پتا نہیں ہے لیکن اس کے باوجود شفافیت اور عوام دوستی کی دعویدار حکومت اس سکیم پر اپنی ساری توانائیاں خرچ کرنے کے لیے بے تاب ہے۔''

اس سکیم پر عمل درآمد کی نگرانی کے لیے 2010ء میں سندھ سرکار کے ایک ایکٹ کے تحت ذوالفقار آباد ڈویلپمنٹ اتھارٹی قائم کی گئی۔ اس کا موجودہ ایم ڈی سید افتخار حسین فوج کا ریٹائرڈ اہلکار ہے۔ اتھارٹی کا سربراہ تو وزیر اعلیٰ سندھ ہے جو اوپر سے آنے والے ہر حکم پر ''قبول ہے'' کے سوا کچھ نہ کہنے کی شاندار تاریخ کا مالک ہے۔ کھربوں روپیہ کی اس سکیم کے بارے میں سرکاری طور پر کوئی تفصیل بیان نہیں کی گئی، تاہم مختلف منتشر دستاویزات، متفرق پریزنٹیشنز اور میٹنگوں سے

مندرجہ ذیل معلومات دستیاب ہوسکی ہیں۔

ذوالفقار آباد سکیم کی سرکاری ویب سائٹ پر اتنی اہم سکیم کو محض ایک صفحہ میں بیان کیا گیا ہے اور اس مختصر نوٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ کراچی سے 150 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک شہر قائم کیا جائے گا جس کے لیے ساڑھے تین لاکھ ایکڑ زمین حکومت سندھ کی طرف سے مختص کی گئی ہے، جب کہ ساڑھے آٹھ لاکھ ایکڑ سے زائد زمین سمندری کناروں کو قابلِ استعمال بنا کر حاصل کی جائے گی۔ اپریل 2011ء میں اتھارٹی کی طرف سے سکیم کے تصوراتی ماسٹر پلان کے لیے جاری کردہ اظہار دلچسپی پر مبنی نوٹس میں بھی کام کے دائرے کے بارے میں محدود معلومات دیتے ہوئے صرف 13 لاکھ 32 ہزار ایکڑ زمین موجود ہونے کے اعداد و شمار دیئے گئے ہیں۔ سندھ سرکار کے محکمہ ریونیو کے تیار کردہ ایک اور پریزنٹیشن میں اس سکیم کے لیے دو آپشن دیئے گئے ہیں۔ اوّلین آپشن میں ضلع ٹھٹھہ کے 4 تعلقوں کیٹی بندر، کارچھان، جاتی اور شاہ بند کو سکیم کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ اس آپشن کے تحت پریزنٹیشن میں 12 لاکھ 90 ہزار ایکڑ زمین سکیم کے لیے استعمال ہونے کا کہا گیا ہے جس میں 3 لاکھ 35 ہزار ایکڑ زمین کو ناقابل اور بیلے کی زمین قرار دیتے ہوئے فوری طور پر موجود ہونے کا بتایا گیا ہے، جب کہ 9 لاکھ 55 ہزار ایکڑ زمین کو بند باندھ کر سمندر کو پیچھے دھکیل کر قابلِ استعمال بنانے کی تجویز دی گئی ہے۔ دوسرے آپشن کے طور پر اس سکیم کو سپر ہائی وے اور نیشنل ہائی وے کے درمیان میں تعمیر کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے جس میں سجاول، میر پور بھٹورو، گھوڑا باڑی، میر پور ساکرو، ٹھٹھہ اور جام شورو میں موجود زمین کے اعداد و شمار دیئے گئے ہیں۔ اس آپشن کے تحت 6 لاکھ 60 ہزار ایکڑ زمین کے قابل استعمال ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ سندھ کی لاکھوں ایکڑ زمین کو قبضہ کر کے استعمال میں لانے اور سندھیوں کے قومی وجود کو نقصان پہنچا سکنے والے اس شہر کی سکیم کے بارے میں سرکاری ادارے اور حکومت خاموش ہیں اور سندھ کے باشندوں کو کچھ بھی بتانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

جوں ہی صدر صاحب نے جون میں اس سکیم کے اہم حصے کے طور پر دھاندھاری کے قریب چھ کلو میٹر کے پونے 4 ارب روپے کی لاگت کے پل کو بنانے کا حکم دیا ہے، حکومت اور چینی سرمایہ

کاروں میں روابط بھی تیز ہو گئے ہیں۔ صدر زرداری کے حالیہ دورۂ چین کے موقع پر مفاہمت کی ایک یادداشت پر بھی دستخط کیے گئے ہیں جس کے بعد چینی سرمایہ کاری کے لیے ذوالفقار آباد میں درمکمل طور پر وا ہو گئے ہیں۔ اس سے قبل 25 اگست 2011ء میں ایک انگریزی اخبار میں شائع شدہ خبر میں بتایا گیا تھا کہ چینی کمپنیوں نے ذوالفقار آباد میں ایک اکنامک زون تعمیر کرنے کی تجویز دی ہے جس کے مطابق 15 برس کے اندر یہ زون تعمیر کر دیا جائے گا۔ حکومت ان سب کاموں کے لیے اتنی جلدی میں ہے کہ پبلک سیکٹر کی ترقیاتی سکیموں کے بارے ضوابط کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔ پاکستان کے پلاننگ کمیشن کے پراجیکٹ مینجمنٹ کی لاگت والی ہر سکیم کی منظوری ECNEC یعنی قومی اقتصادی کونسل کی کاروباری کمیٹی کو دینی ہے، مگر ذوالفقار آباد سکیم اکنک سے بھی منظور نہ کروا کر قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ پیپلز پارٹی جب اپوزیشن میں تھی تو گریٹر تھل کینال کی سکیم کو اکنک سے منظور نہ کروانے پر مشرف حکومت پر سخت تنقید کیا کرتی تھی۔ اب پی پی حکومت نے خود اس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس سکیم کے لیے بجٹ میں رقم بھی رکھ دی ہے۔ اگر یہ سکیم مشرف دور حکومت میں سامنے آتی تو پیپلز پارٹی اسے سندھ دشمن سکیم قرار دے کر ایک طوفان برپا کر دیتی۔

ذوالفقار آباد سکیم سے اہل سندھ کو جو خطرہ فوری طور پر درپیش ہے، وہ ہے سندھ میں سندھیوں کے اقلیت میں تبدیل ہو جانے اور دنیا شہر تعمیر ہونے کی صورت میں لاکھوں افراد کی غول در غول بیرون سندھ سے آمد کا۔ سندھی پہلے ہی تقسیم کے وقت اغیار کی آبادکاری کی وجہ سے کراچی اپنے ہاتھوں سے نکل جانے کا تجربہ بہ چشم خود ملاحظہ کر چکے ہیں۔ تقسیم کے وقت کراچی کی آبادی ساڑھے چار لاکھ افراد پر مشتمل تھی جن میں سندھی بولنے والے 61 فیصد، جب کہ اُردو بولنے والے محض 6.3 فیصد ہی تھے۔ بعد از تقسیم ہونے والی غیر قانونی نقل مکانی کی وجہ سے 1951ء کی مردم شماری کے مطابق شہر کی آبادی ساڑھے گیارہ لاکھ ہو گئی جس میں سندھی کم ہو کر 8.6 فیصد اور اُردو بولنے والی آبادی بڑھ کر 50 ہو گئی۔ بیرونی آبادی کی متواتر یلغار کے نتیجے میں 1998ء کی مردم شماری کے مطابق شہر میں سندھی بولنے والوں کا حصہ صرف 7.22 فیصد ہے۔ مذکورہ مردم شماری کے مطابق

سندھ میں سندھی بولنے والے تقریباً 62 فیصد تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سندھی اپنی ہی سرزمین پر اقلیت میں تبدیل ہونے سے محض تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑے تھے۔ اگر ذوالفقار آباد جیسا نیا شہر تعمیر کیا گیا تو اس میں سرمایہ کاری کے لیے کروڑوں بلکہ اربوں روپے کی ضرورت پیش آئے گی۔ صاف ظاہر ہے کہ دیہی علاقوں میں بہ مشکل زندہ معیشت پر انحصار کرنے والے سندھی اس نئے شہر میں پاؤں رکھنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ دیہی سندھ کی معیشت پانی کی لگاتار قلت اور دو بڑے تباہ کن سیلابوں کی وجہ سے تباہ حال ہے اور گزشتہ 6 دہائیوں سے دیہی سندھ میں کوئی نمایاں صنعت کاری نہ ہونے کی وجہ سے سندھی کسی صنعتی سرمایہ کاری کا کوئی تجربہ بھی نہیں رکھتے۔ نتیجتاً سندھی نئے شہر میں جائیداد اور صنعت میں کوئی خاص سرمایہ کاری کرنے سے محروم رہیں گے اور ملک کے دیگر صوبوں نیز بیرونی ممالک سے لاکھوں افراد کے غول سندھ آئیں گے، جس کے بعد سندھی اپنی ہی دھرتی پر اقلیت میں تبدیل ہو کر رہ جائیں گے۔ باہر سے آنے والے لاکھوں افراد سندھ کا ڈومیسائل اور شناختی کارڈ بھی بنوالیں گے اور ووٹ دینے کا حق بھی حاصل کر لیں گے جس کی وجہ سے سندھیوں کا سیاسی مستقبل بھی تاریک ہو جائے گا اور اس سارے عمل میں زیادہ سے زیادہ دس تا پندرہ سال لگیں گے۔ ذوالفقار آباد سے پیپلز پارٹی کے چند افراد تو اربوں پتی بن جائیں گے مگر سندھیوں کا مستقبل داؤ پر لگ جائے گا۔

ذوالفقار آباد کے ایم ڈی نے ذوالفقار آباد کے لیے چین کے شہر شین ژن (Shen Zhen) کو اپنا ماڈل قرار دیا ہے۔ اس شہر کے بارے میں مختصر معلومات یہ سمجھنے میں مددگار ثابت ہوں گی کہ شین ژن جیسا شہر ذوالفقار آباد اہل سندھ سے کیا کرے گا! چین کے جنوبی علاقے میں پرل (Pearl) ندی کے ڈیلٹا میں واقع یہ شہر ہانگ کانگ کے شمال میں ہے۔ اس شہر کو چین نے 1980ء کے قریب سپیشل زون کے طور پر ترقی دلائی اور اسے سب پراونشل انتظامی درجہ دیا گیا اور چین میں اس سے مراد صوبے کے اندر ایک ایسے شہر سے ہے جو ہوتا تو صوبائی انتظام کے ماتحت ہے مگر اقتصادی اور قانونی پہلوؤں سے انتظامی طور پر الگ ہوتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے گویا کہ جس طرح مشرف دور اقتدار میں کراچی کی سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کی حیثیت تھی۔ شین ژن شہر 1979ء تک ماہی گیروں کی

ایک بستی تھی جس کی آبادی تقریباً تین لاکھ تھی۔ شہر کو جدید طرز کا معاشی مرکز بنانے کے بعد اب اس کی آبادی تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ ہے جس میں 60 لاکھ باہر سے آنے والے ورکر ہیں۔ 1980ء سے قبل اس شہر کے اصلی باشندوں کی زبان کینٹونیز (Cantonese) تھی، اب وہاں کی زبان تبدیل ہو کر منڈارن (Mandarin) بن چکی ہے اور شہر کے اصل باشندے اپنی شناخت اور کلچر کھو بیٹھے ہیں۔ ٹھٹھہ کے ساحلی اضلاع بھی شین ژن کی طرح ماہی گیروں کی بستیاں ہیں۔ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق اس کے چاروں تعلقوں کی حالیہ آبادی تقریباً 4 لاکھ ہوگی اور اہل علاقہ سندھی زبان بولتے ہیں، لیکن ذوالفقار آباد شہر کی تعمیر کے بعد سندھی بولنے والے ماہی گیران علاقوں سے بالکل اسی طرح عنقا ہو جائیں گے جس طرح کراچی بننے کے بعد ہوا تھا۔ یہ بات محض اس ایک شہر تک ہی محدود نہیں رہے گی بلکہ اس کی وجہ سے صوبے کی ڈیموگرافی بھی مکمل طور پر تبدیل ہو جائے گی اور ایک دو عشروں ہی میں سندھی اپنی ہی دھرتی پر اقلیت میں تبدیل ہو کر رہ جائیں گے۔

چین کی اس خطے میں دلچسپی اور امریکہ سے اس کی معاشی اور عسکری میدان میں شروع ہونے والی سرد جنگ کے بعد چین اس سمندری پٹی پر ایک دوسرے شہر اور بذریعہ پورٹ امریکہ سے سرد جنگ کا نیا میدان سجانا چاہتا ہے۔ امریکہ سے عسکری تعلقات میں کشیدگی در آنے کے بعد پاکستان اسٹیبلشمنٹ اس پر دباؤ بڑھانے کے لیے چین سے تعلقات مضبوط کرنے کے لیے کئی معاہدوں پر کام کر رہی ہے۔ پاکستان کے شمالی علاقوں میں پانی سے وابستہ کئی منصوبوں میں چین کی سرمایہ کاری شامل ہے۔ ان میں بھاشا ڈیم اور اسلام آباد کو پانی فراہم کرنے والی سکیمیں بھی ہیں۔ جنوبی علاقے میں سمندری پٹی پر یہ اہم سرمایہ کاری ہوگی جس سے چین ہندی/ عربی سمندری پٹی پر امریکہ سے سرد جنگ میں ایک اہم پیش رفت کر رہا ہوگا۔ ادھر امریکہ چین کے ہمسائے میں موجود بھارت کو دفاعی حکمت عملی کے طور پر نئے معاہدوں کے ذریعے سے اپنا اتحادی بنا رہا ہے جس کا مقصد چین اور پاکستان دونوں پر دباؤ بڑھانا ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ جس طرح گوادر کے منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے منظم خونریزی کروا کر سرمایہ کاروں کو بھگا دیا گیا، اسی طرح

سندھ میں چین اور امریکہ کی سرد جنگ کے نتیجے میں صوبے میں امن وامان کی صورت حال کو خراب کر دیا جائے۔ حالیہ چند ماہ میں رونما ہونے والے بعض واقعات سے اس نوع کے اشارے بھی ملتے ہیں جو مزید خطرناک شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ اگر حکومت کو سندھ میں ترقی کے عمل سے کچھ دلچسپی ہے تو کراچی میں ترقی سے محروم سندھی اور بلوچ آبادیوں میں ترقیاتی عمل شروع کرانے کے ساتھ باقی سندھ کے ضلعی ہیڈ کوارٹرز کی ترقی پر وسائل خرچ کرے۔ کراچی سے باہر سندھ کے بڑے شہروں میں انفراسٹرکچر انتہائی خراب حالت میں ہے جسے بہتر بنانے کے لیے حکومت ہمیشہ وسائل نہ ہونے کا عذر پیش کرتی ہے۔ سندھ میں کراچی کے علاوہ کوئی بھی شہر صحیح معنوں میں شہر کا منظر پیش کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ سکھر، دادو، میر پور خاص، نواب شاہ، خیر پور، میرس، لاڑکانہ، عمر کوٹ، جامشورو، سانگھڑ، جیکب آباد، گھوٹکی، شکار پور وغیرہ دراصل شہر نما مرکز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سارے ملک اور دوسرے صوبوں کے باشندے بھی کراچی ہی کا رخ کرتے ہیں۔ کراچی سے آبادی کا دباؤ ہٹانے کے لیے اس کا حل ذوالفقار آباد کی تعمیر نہیں بلکہ سندھ کے دوسرے ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز اور ضلعی مراکز کو ترقی دینے میں مضمر ہے۔ اس معاملے میں پنجاب سے سبق سیکھنا چاہیے جس نے لاہور کے ساتھ گجرات، گوجرانوالہ، فیصل آباد، شیخوپورہ، سیالکوٹ، ملتان وغیرہ جیسے دیگر شہری مراکز قائم کر کے آبادی کے دباؤ سے کسی حد تک لاہور کو بچا لیا ہے۔ 1998ء میں جب سندھ کی شہری آبادی کا 62 فیصد کراچی میں رہائش پذیر تھا، پنجاب کی شہری آبادی کا صرف 22.3 فیصد لاہور میں رہتا تھا۔ اب بھی اس تناسب میں کوئی غیر معمولی فرق نظر نہیں آتا۔ سندھ میں بیرونی آبادی کی یلغار کا اثر یہ ہوا ہے کہ 1998ء کے اعداد و شمار کے مطابق سندھ کی شہری آبادی میں سندھی بولنے والوں کا تناسب 25.75 فیصد تھا۔ جب پنجاب کی شہری آبادی کا 78.75 فیصد پنجابی سپیکنگ اور خیر پختونخواہ کی شہری آبادی کا 73.55 فیصد پشتو بولنے والوں پر مشتمل تھا۔ اس پس منظر میں دیکھیے کہ ذوالفقار آباد سندھ کے شہری علاقوں میں سندھی بولنے واوں کے تناسب کو کس طرح اقلیت میں تبدیل کر ڈالے گا۔ اہل سندھ ترقی کے خلاف ہرگز نہیں ہیں، مگر وہ ایسی ترقی کو قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں جو اُن کے وجود اور شناخت کو اُن کی اپنی ہی دھرتی سے معدوم کر ڈالے۔''

سرد جنگ کے نئے دور میں کراچی کی اہمیت

جب سے پاکستان میں نئے صوبوں پر بحث کا آغاز ہوا ہے، سرائیکی اور ہزارہ صوبے کی تحریکوں کے بعد سندھ میں مہاجر صوبے کے ڈرامے کو بھی آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ شہر کی مخصوص آبادی میں شروع کیے گئے چھوٹے چھوٹے مظاہروں اور پوسٹرز کا سلسلہ آگے بڑھ کر ریڈ زون میں خواتین کے جلوسوں تک پہنچایا گیا ہے۔ ریڈ زون جہاں اگر غریب اساتذہ بھی کوئی مظاہرہ کرنے کی جرأت کر بیٹھیں تو ان کا استقبال لاٹھیوں اور آنسو گیس سے کیا جاتا ہے، اس حساس علاقے میں سینکڑوں خواتین کو بسوں میں بھر کر لانے اور سندھ کی تقسیم کے لیے مظاہرہ کرنے کی اجازت کس نے دی؟ اس سوال کا جواب بڑا سادہ ہے اور اس کے لیے اعلیٰ فہم و فراست درکار نہیں۔ شہر میں لگنے والے بل بورڈز اور چاکنگ کا نوٹس لینے کی کارروائی میں اتنی تاخیر کرنے والی سندھ حکومت کی خاموش رامندی کا ایک ہی مقصد ہے کہ سندھی عوام کو بلیک میل کر کے ووٹ لیے جائیں کہ اگر سندھ کے ووٹ پیپلز پارٹی کو ملنے کے بجائے تقسیم ہو گئے تو حکومت ان لوگوں کو ملنے کا خدشہ ہے جو سندھ کی تقسیم کے خواہاں ہیں۔

سندھ میں لسانی بنیادوں پر صوبے کے قیام کا مطالبہ نیا تو نہیں، ماضی میں جناح پور کے نقشوں سے بھی قبل 1972ء میں مرزا جواد بیگ کی جانب سے شہر میں میٹروپولیٹن حکومت تشکیل دینے کا مطالبہ اور منصوبہ بھی لوگوں کے ذہنوں سے فراموش نہیں ہوا ہوگا۔ میٹروپولیٹن حکومت کا یہ تصور مشرف کی جانب سے کراچی کو شہری حکومت قرار دے کر سفید و سیاہ کا مالک بنانے سے مختلف نہ تھا۔ مرزا جواد

بیگ کی اس تحریک میں بھی میٹروپولیٹن حکومت نہ بننے کی صورت میں کراچی کو ایک صوبہ بنانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اب بھی بلدیاتی اداروں کے نظام میں کراچی کو مطلوبہ شہری ریاست جیسی حیثیت حاصل نہ ہو سکنے کے بعد الگ صوبے کا ڈرامہ شروع کیا گیا ہے۔ اس مہم کے دوران پس پردہ بڑی عالمی طاقتوں کے کیا مفادات پنہاں ہو سکتے ہیں، اس منصوبے میں ان کا جائزہ لیا گیا۔ کراچی کو الگ شہری ریاست بنانے میں بڑی طاقتوں کے مفادات کو سمجھنے کے لیے پہلے کراچی کے موجودہ جغرافیائی محل وقوع کو سمجھتے ہیں۔

کراچی جنوبی ایشیا میں بحیرہ عرب کے ساحل پر واقع ہے۔ بحیرہ عرب اور بحر ہند کے ساحلوں پر کراچی کے مشرق اور جنوب میں ایشیا اور بحرالکاہل کے بڑے ساحلی شہر آباد ہیں جن میں ممبئی، مدراس، کولمبو، کولکتہ، ینگون، ملاکا، سنگاپور، بنکاک، ہانگ کانگ اور تائیوان کے علاوہ چین، جاپان اور کوریا کے ترقی یافتہ جدید صنعت وٹیکنالوجی کے علمبردار ساحلی شہر شامل ہیں۔ کراچی کے جنوب مسقط، دبئی، ایران اور اس سے آگے سعودی عرب کا راستہ ہے۔ جنوب مغربی سمت براعظم افریقہ ہے جو قدرتی وسائل کے باوجود بھوک اور بدحالی کا شکار رہا ہے تاہم رفتہ رفتہ بین الاقوامی تجارت میں اہم خطہ کے طور پر اُبھر رہا ہے۔ ان تمام ساحلی ممالک اور شہروں کا نقشہ سامنے رکھنے سے کراچی کے جغرافیائی محل وقوع کی اہمیت خود ہی اجاگر ہو جائے گی۔ شہر کی دو بندرگاہیں کراچی پورٹ اور قاسم پورٹ اس کی جغرافیائی اہمیت کو دوچند کر دیتی ہیں جبکہ مغرب میں گوادر اور مشرق میں کیٹی بندر کی صورت میں مستقبل کی بندرگاہ اس ساحلی پٹی کی سٹریٹجک اہمیت کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ سندھ کی ساحلی پٹی کے نزدیک تھرکول کی صورت میں توانائی کا انمول ذخیرہ اس تمام پٹی کی سیاسی اور اقتصادی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ کر دیتا ہے۔ واضح رہے کہ ساحلی پٹی کو ساری دنیا میں معاشی لحاظ سے اہم ترین علاقہ تصور کیا جاتا ہے۔ دنیا کی سات ارب آبادی میں سے اس وقت تین ارب کے لگ بھگ نفوس ساحلی پٹی کے 200 کلومیٹر کے اندر آباد ہیں اور ساحلی شہروں میں آبادی کی کثافت 80 نفوس فی مربع کلومیٹر ہے جو اوسط کثافت سے دوگنا ہیں۔ اس پس منظر میں کراچی کی معشی اور سیاسی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

بحر ہند، بحیرہ عرب اور جنوبی چینی سمندر کو اس لیے بھی معاشی اور عسکری اہمیت حاصل ہے کہ چین، جاپان اور بھارت جیسی تین اہم اقتصادی اور عسکری قوتیں اس خطہ میں واقع ہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں کے دوران چین نہ صرف ایک زبردست معاشی قوت بن کر ابھرا ہے بلکہ اپنی عسکری اور سفارتی طاقت کے ذریعے وہ ایشیا، بحرالکاہل اور افریقہ میں امریکی مفادات کے لیے رفتہ رفتہ تشویشناک صورت حال اختیار کرتا جارہا ہے۔ جاپان، فلپائن، تائیوان، کوریا اور بھارت جیسے پڑوسی ممالک سے کشیدہ سرحدی تعلقات کے باوجود ان ممالک کے ساتھ ساتھ پاکستان، ایران، روس اور متعدد افریقی ممالک کے ساتھ گہرے اقتصادی تعلقات قائم کرکے چین ان خطوں میں امریکی مفادات کے لیے کوئی بڑا خطرہ نہ سہی تاہم باعث تشویش ضرور بنا ہوا ہے۔ اس خطہ میں پاکستان اور افغانستان ایسے دو بڑے ممالک ہیں جہاں امریکہ نے اپنے قدم کسی حد تک جمارکھے ہیں اور ہزاروں کلومیٹر فاصلہ کے باوجود وہ اس خطہ کی اہم عسکری طاقت بنا ہوا ہے۔ خطے میں چین کے بڑھتے ہوئے عسکری اثر ورسوخ پر ضابطہ رکھنے کے لیے امریکہ، فلپائن اور جاپان سے بہتر عسکری تعلقات استوار کرنے کے ساتھ ساتھ جنوبی ایشیا، بحر ہند اور بحیرہ عرب و چین میں فوجی قوت کا توازن اپنے حق میں بہتر بنانے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھا رہا ہے۔ افغانستان میں براہ راست جنگ اور ایران کے ساتھ سرد جنگ میں اپنی سفارتی اور عسکری قوت کا بڑا حصہ صرف کرنے والا امریکہ اس خطے میں چین کے نفوذ کو روکنے کے لیے مختلف حکمت عملیوں کی تشکیل اور ان پر عملدرآمد میں مصروف ہے۔ خطے کے بحری نقشہ کا بغور جائزہ لیا جائے تو دو اہم بحری راستے نظر آتے ہیں: مشرقی سمت آبنائے ملاکا ہے جس کی ایک جانب سماترا کا جزیرہ اور دوسری جانب ملائیشیا اور سنگاپور واقع ہیں۔ کراچی کے مغرب میں آبنائے ہرمز ہے جو بحیرہ عرب کو خلیج فارس سے منسلک کرتا ہے۔ ان دونوں آبنائے کے درمیان کراچی واقع ہے، اگرچہ کراچی آبنائے ہرمز کے زیادہ قریب ہے۔

اب ان دو بحری راستوں کی اہمیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ آبنائے ملاکا جنوبی چینی بحیرہ کو بحر ہند سے جوڑتا ہے۔ براعظموں کے درمیان ہونے والی تجارت کا 90 فیصد سمندر کے ذریعے ہوتا ہے جبکہ

تیل کی دو تہائی ترسیل بھی بحری راستوں سے ہوتی ہے۔ ایک تخمینہ کے مطابق بحری راستوں سے ہونے والی تجارت سے وابستہ 50 فیصد بحری جہاز آبنائے ملاکا سے گزرتے ہیں جو بعد ازاں بحر ہند میں داخل ہوتے ہیں جبکہ دنیا کے نصف بحری ٹینکر اس سمندری خطے کو استعمال کرتے ہیں۔ خلیج فارس اور مشرق وسطیٰ اور بحرالکاہل کے درمیان پیٹرولیم مصنوعات کی تجارت کا 70 فیصد بحری راستوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ بھارت اور چین کے اقتصادی قوت کے طور پر سامنے آنے کے ساتھ ہی اس سمندری خطہ سے پٹرولیم اور تجارتی مصنوعات کی بحری ترسیل میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 2030ء تک دنیا میں توانائی کا نصف استعمال صرف بھارت اور چین میں ہوگا۔ اس وقت امریکہ کے بعد چین دنیا کی دوسری بڑی معیشت ہے اور اس تناسب سے اس کی توانائی ضروریات بھی بڑھ رہی ہیں، توانائی کی دوڑ میں جاپان تیسرے جبکہ بھارت چوتھے نمبر پر ہے۔ توانائی ضروریات کے 90 فیصد کو پورا کرنے کے لیے تیل پر انحصار کرنے والے بھارت اور چین کے لیے آبنائے ملاکا اور آبنائے ہرمز اہم بحری راستے ہیں۔ بھارت 2025ء تک توانائی کے استعمال کی دوڑ میں جاپان کو پیچھے چھوڑ دے گا جبکہ توانائی کے تین اہم مراکز بھی اس خطہ میں ہوں گے۔ چین کی معاشی شرح نمو گزشتہ تین دہائیوں کے دوران 10 فیصد سالانہ کے قریب رہی ہے۔ 1995ء سے 2005ء کے دوران چین کی تیل کی کھپت دوگنا ہو چکی ہے۔ سعودی عرب کی تیل کی پیداوار کا نصف حصہ چین کو برآمد ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر چین کے تیل کا 85 فیصد آبنائے ہرمز اور آبنائے ملاکا سے گزرتا ہے۔ آبنائے ملاکا کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کرنے والی اہم علاقائی اقتصادی قوتوں میں جاپان، کوریا، تائیوان، فلپائن، ہانگ کانگ، سنگاپور، کمبوڈیا، ویت نام، تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور ملائیشیا شامل ہیں۔ یعنی جنوب مشرقی ایشیا کی اہم تجارتی اقوام کا زیادہ انحصار اس بحری راستے پر ہے۔ مغربی سمت میں سری لنکا، بنگلہ دیش اور بھارت واقع ہیں جہاں اہم تجارتی بندرگاہیں موجود یا زیر تعمیر ہیں۔

دوسری جانب سعودی عرب، ایران اور متحدہ عرب امارات کے تیل کا گزر آبنائے ہرمز سے ہوتا ہے۔ یہ خطہ اس وقت تیل کی فراہمی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور دنیا کے تیل کا قریباً 40 فیصد اس

آبنائے سے گزرتا ہے۔ 2011ء میں آبنائے ہرمز سے اوسطاً پونے دو کروڑ بیرل یومیہ تیل کی ترسیل ہوتی رہی ہے۔ اس کا 85 فیصد تیل ایشیائی ممالک، جاپان، بھارت، جنوبی کوریا اور چین کو جاتا رہا ہے۔ اس تناظر میں آبنائے ہرمز سٹریٹجک لحاظ سے نہایت حساس ہے۔ آبنائے ہرمز سے 240 میل کے فاصلہ پر گوادر کی بندرگاہ ہے۔ یاد رہے کہ 250 ملین ڈالر لاگت سے تعمیر ہونے والی گوادر بندرگاہ کا 80 فیصد سرمایہ چین نے فراہم کیا ہے۔ گوادر میں چین کی موجودگی کا مقصد ہے کہ آبنائے ہرمز سے گزرنے والے تیل کے کنٹینرز کی عملی نگرانی کرنا۔ دوسری جانب جنوب مشرقی سمت سری لنکا کے ساحلی شہر ہمبنٹوتہ کے قریب کولمبو سے بھی بہتر اور جدید بندرگاہ زیر تعمیر ہے۔ کروڑوں ڈالر مالیت کے اس منصوبے کے لیے سرمایہ چین کے امپورٹ ایکسپورٹ بینک سے حاصل کیا گیا ہے۔ بظاہر تجارتی نوعیت کے اس منصوبہ کے ذریعے چین خطہ میں اپنی موجودگی کو مزید مستحکم بنا سکتا ہے۔ بنگلہ دیش کے ساحلی شہر چٹا گانگ میں کنٹینرز کے لیے بڑے سہولتی منصوبہ میں بھی چین شامل ہے۔ وہ دنیا بھر کی سخت تنقید کا شکار میانمر کے فوجی آمروں کی بھی دل کھول کر امداد کرتا رہا ہے تا کہ اس سمندری خطہ میں اپنے قدم مضبوط کر سکے۔ میانمر میں سڑکوں اور پائپ لائن منصوبوں کے علاوہ بحری تنصیبات کی تعمیر میں بھی چین کی مالی معاونت شامل ہے۔ اس سمندری خطے میں اپنے قدم جمانے کی پرامن ترقی سے متعلق پالیسی کو چین موتیوں کی مالا (String of Pearls) کا نام دیتا ہے۔ موتیوں کی یہ مالا درحقیقت سیاسی اور معاشی طاقت کے فروغ کی پالیسی ہے۔ افریقہ میں اپنا اقتصادی اثر بڑھانے کے لیے چین نے بڑے تجارتی معاہدے کیے ہیں۔ 2004ء میں چین نے افریقہ میں 900 ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کی۔ قبل ازیں 2000ء میں اس نے افریقہ کے 1.2 ارب ڈالر کے قرضے معاف کیے تھے، جبکہ 2003ء میں مزید 750 ملین ڈالر کے قرضے معاف کیے گئے۔ 2006ء میں چین کی جانب سے اس خطہ میں 60 ارب ڈالر کے تجارتی معاہدے کیے گئے اور اس طرح 2007ء تک چین افریقہ میں 100 ارب ڈالر کی براہ راست سرمایہ کاری کر چکا ہے۔ نتیجتاً اب چین اپنے تیل کا تقریباً ایک تہائی افریقی ممالک سے درآمد کر رہا ہے۔ سوڈان، گنی، کانگو، نائیجیریا اور انگولا چین کے لیے تیل کے اہم ذرائع ہیں۔ تیل کی ترسیل کے لیے بحر ہند اور آگے چل کر آبنائے ملاکا استعمال ہوتا ہے۔

اب بحر ہند/ بحیرہ عرب کے مجموعی نقشہ میں کراچی کے محل وقوع کے بغور مشاہدہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ اور چین اس خطہ میں ایک شدید سرد جنگ میں مصروف ہیں۔ افغان جنگ سے دامن چھڑانے کے بعد امریکہ کو اس سرد جنگ کے لیے زیادہ مسائل اور وقت دستیاب ہو سکے گا۔ آبنائے ہرمز کے قریب ایران کے ساتھ امریکہ کا تنازعہ دن بدن شدت اختیار کر رہا ہے جبکہ چین کے ساتھ فلپائن اور تائیوان کے تنازعہ میں بھی امریکہ بلاواسطہ فریق بنا ہوا ہے۔ جنوبی ایشیائی بحیرہ عرب اور بحر ہند میں امریکہ کو پاکستان اور متحدہ عرب امارات تک بہتر سیاسی اور عسکری رسائی حاصل ہے تاہم پاکستان کی سیاسی اہمیت یکسر مختلف ہے، اس لیے اس خطہ میں چین کے فوجی، معاشی اور سیاسی اثر کو روکنے کے لیے پاکستان سرد جنگ کے اس دور میں امریکہ کے لیے نہایت اہم ہے۔ ان حالات کے پیش نظر سیاسی بارگیننگ کے طور پر بلوچ رہنماؤں نے امریکی کانگریس کی خصوصی کمیٹی میں بلوچستان سے متعلق بحث کے دوران امریکہ کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ آزادی کی جدوجہد میں مدد کے بدلے وہ گوادر پورٹ کا انتظام امریکہ کے حوالے کرنے اور ایران پاکستان گیس پائپ لائن منصوبہ کے خاتمے میں مدد کریں گے۔ چین کے زیر اثر گوادر بندرگاہ پر تسلط کی خاطر امریکہ کے لیے یہ پیشکش بظاہر پرکشش ہوگی۔ اگر یہاں سے چند سو میل کے فاصلہ پر کراچی کی بندرگاہ بھی ایسی ہی کسی وفادار قوت کے زبردست ہو تو امریکہ کو اور کیا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی میں ایم کیو ایم اور اے این پی دونوں کراچی کی ملکیت کے دعویٰ پر خونریزی میں مصروف ہیں۔ دونوں فریقین امریکہ کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ کراچی کی اصل قوت وہ ہیں، جب تک اے این پی نے کراچی کی سیاسی ملکیت کا دعویٰ نہیں کیا تھا ایم کیو ایم کو پشتونوں سے کوئی شدید مسئلہ نہیں تھا۔ اب کراچی کو الگ صوبہ بنا کر اسے ساحلی پٹی اور تھر تک توسیع دینے کی بات کر کے ایک فریق امریکہ کو یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ ہمیں یہ شہر اور ساحلی پٹی مل جائے تو بحیرہ عرب میں ایک وفادار قوت آپ کی معاونت کے لیے دست بستہ حاضر ہوگی۔ گوادر اور کراچی جیسی بندرگاہوں والے اہم شہر امریکی وفادار قوتوں کے زیر تسلط ہونے سے جنوبی ایشیا میں چین کی عسکری توسیع کے سدباب میں امریکہ کو ایک قابل اعتماد سہولت دستیاب ہو سکے گی۔ یہاں بیٹھ کر ایران کو ان بھی آنکھ دکھائی جا سکتی ہے اور چین پر بھی رعب جمایا جا سکے گا۔ اس تصوراتی خاکے میں

کراچی سمیت پاکستان کی تمام ساحلی پٹی کی علیحدگی کے معاملے کو سمجھا جا سکتا ہے۔ پاکستان کی ملٹری اسٹیبلشمنٹ پر مکمل اعتماد کے فقدان کے باعث امریکہ کے لیے ساحلی شہروں کا کسی وفادار قوت کے پاس ہونا سیاسی اور عسکری لحاظ سے بہت اہم ہے، جیسے جیسے پاکستان کی ملٹری اسٹیبلشمنٹ سے امریکہ کے تعلقات خراب ہو رہے ہیں ویسے ویسے بلوچستان کی آزادی کی تحریک نیا رخ اختیار کر رہی ہے اور سندھ میں الگ صوبے کا ڈرامہ بھی زور پکڑ رہا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر کسی مرحلے پر امریکہ نے ایسا فیصہ کیا تو پھر یہ صرف ایک الگ صوبہ نہیں بلکہ الگ ساحلی ریاست کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ جنوبی ایشیا کے بحیرہ عرب/بحر ہند میں عالمی طاقتوں کی اس نئی سرد جنگ میں کراچی ایک اہم مرکز بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچانک کراچی کی محرومی کا بے بنیاد راگ الاپنے کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ تمام ڈرامہ اس عظیم منصوبہ بندی میں حصہ لینے کی کوششوں کا حصہ ہے۔ علمی طور پر یہ سب کچھ کس طرح ممکن ہوگا، اس سے درجنوں سوال جڑے ہیں تاہم یہ چند غیر مصروف افراد کی ذہنی اختراع نہیں۔ اس مطالبے کے ڈرامے سے متعدد گہرے مفادات منسلک ہیں جو وقت کے ساتھ آشکار ہوں گے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ عالمی قوتوں کے تعلقات اور فیصلے اصولوں اور اقدار کی بنیاد پر نہیں بلکہ مفادات کے تحت ہوتے ہیں اور کراچی مفادات کی اس جنگ میں ایک اہم محاذ بن سکتا ہے۔

ہندوؤں کی نقل مقانی: سازش، پروپیگنڈا اور حقیقتیں

ویسے تو سندھ کے دیہات، خاص طور پر شمالی سندھ میں ہندوؤں کی نقل مقانی کوئی نئی بات نہیں مگر قومی میڈیا پر ایسی رپورٹوں کے شائع ہونے کے بعد صدر صاحب اور ان کی ٹیم کے خاص ارکان سرگرم ہوگئے ہیں۔ بڑے ٹی وی چینلز پر ایسی خبریں شائع ہونے کے بعد یہ تاثر ملنے لگا کہ شاید سندھ اور بلوچستان میں سندھی ہندوؤں کے ساتھ زیادتیاں اور اُن کی نقل مقانی کوئی نیا پیش آنے والا واقعہ نہیں ہے۔ سندھ کے باشندے عشروں سے سندھی ہندوؤں کے اغوا برائے تاوان، اُن کی عورتوں کے جبری مذہب تبدیل کرانے اور ھندوؤں کی نقل مقانی کے قصوں سے آگاہ ہیں۔ سندھی میڈیا اُن خبروں اور واقعات کو شروع سے ہی کوریج دیتی رہی ہے۔ سندھ کی سیاسی قوتیں اور سول سوسائٹی اِس استبداد کے خلاف مُسلسل آواز اُٹھاتی رہی ہیں۔ مگر جیسا کہ یہ سب کچھ سندھ [اور اب بلوچستان میں بھی] ہو رہا ہے۔ اور اس پر آواز صرف سندھی میڈیا ہی اُٹھاتی رہی ہے۔ اس لیے سندھ سے تعلق رکھنے والے صدر صاحب، سندھ کی سیٹ پر سینیٹر بننے والے وزیر داخلہ رحمان ملک اور سندھ کے وزیر اعلیٰ قائم علی شاہ نے نہ پہلے کبھی اس معاملے پر بیان جاری کیا اور نہ ہی کمیٹیاں بنانے کی زحمت کی۔ صدر صاحب تو اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے ہیں جہاں سندھ کی فریاد مارگلہ کی پہاڑیوں سے ٹکرا کر واپس لوٹ جاتی ہے، مگر حکومت سندھ کا ردِعمل بھی نام نہاد قومی میڈیا کی کوریج کے بعد ظاہر ہونے کو کیا کہا جائے؟ زمانے سے بے خبر رہنے والے وفاقی وزیر داخلہ رحمان ملک نے اپنا پُرانا ٹائپ کیا ہوا بیان جاری کر دیا کہ ملک سے ہندوؤں کی نقل مقانی سازش ہے۔ اس

نے یہ نہیں بتایا کہ یہ سازش کوں کر رہا ہے اور ان پر یہ اچانک انکشاف اب کیوں ہوا ہے؟ رحماں ملک صاحب کو یہ معلوم ہے یا نہیں، کہ کتنے سالوں سے سندھی ہندو لڑکیوں کو اغوا کروا کے ان کے جبراً مذہب تبدیل کرنا اور پریم کی شادیوں کے ڈرامے کرنے والوں میں ان کی پارٹی سے تعلق رکھنے والے ایک اسمبلی ممبر بھی نمایاں طور پر شامل ہیں۔ وہ صاحب اتنا اثر ورسوخ والے ہیں کہ ہندو بیٹیوں کی کورٹ میں شنوائیوں پر ہتھیار بند افراد کو کورٹ کے باہر جمع کر کے رحمان ملک صاحب کے اپنے ہی ادارے پر تمسخر اُڑا رہے ہوتے ہیں۔ مگر ان کو یہاں کوئی بھی سازش دکھائی نہیں دیتی۔ اسی طرح ملک کے اندر مضبوط ترین اور آزاد سمجھا جانے والا ادارہ بھی ہندو لڑکیوں کے معاملات میں فیصلوں کے وقت مُقتدر قوتوں کے ساتھ اُلجھنے سے اجتناب برتتا ہے۔ پتہ نہیں وہ سازش کس کی ہوتی ہے؟ بلوچستاں میں بیگناہ لوگوں کے قتل عام سے لے کر ہندوؤں کی نقل مقانی تک ہر اُلٹے کام کو دوسروں کے کھاتے میں ڈالنا سب سے آسان نُسخہ ہے۔ اور یہ نُسخہ اس ملک میں ہر حکومت کامیابی سے استعمال کرتی ہے۔ رحمان ملک کو بھی کُچھ اور کہنے کی جُرات نہ ہوئی تو انہوں نے بھی روایتی لفاظی کر کے بوجھ اُتارنے کی کوشش کی۔ ایسی باتیں صدر صاحب کی کمیٹی کے دیگر ممبران نے بھی کیں۔ سندھی ہندوؤں کو اس ملک کے باگ ڈور چلانے والوں نے پہلے دن سے ہی باہر کا ایجنٹ اور مُلک دشمن قرار دے کر ان کو مختلف طریقوں سے تیسرے درجے کا شہری بنایا ہُوا ہے۔ یہ تو سندھ اور بلوچستان کی روایات اور سیکولر اقدار کی مہربانی ہے کہ ہندو بغیر کسی خوف وخطر کے ان دونوں صوبوں میں زندگی گزارتے آئے ہیں۔ نہیں تو پنجاب میں اقلیتوں کے ساتھ جو تمسخر اور تعصّبانہ رویہ روا رکھا گیا ہے اس سے پوری دنیا میں ملک کی بدنامی ہوئی ہے۔ قریب ماضی میں سلمان تاثیر اور شہباز بھٹی کے قتل کے واقعات نے تو پنجاب میں اقلیتوں کے لیے زندگی عذاب کر دی ہے۔ پہلے دن سے ہی مذہب کے بنیاد پر ریاست قائم کر کے مذھبی اور فرقہ وارانہ نفرتوں کے بیج بوئے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1953ء میں احمدی جماعت کے خلاف خونریز مہم کی شروعات کی گئی۔ نتیجے میں فوج کو مارشل لا لگا کر کے بلوؤں پر قابو کرنا پڑا۔ اس طرح مذہبی مُنافرت نے اس ملک کو شروع میں ہی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ مذہبی شدت پسندی ملک کی رگوں میں کینسر کی طرح پھیل گئی اور اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کر ڈالا۔

مذہبی نفرت کے بل بوتے پر ایسے کام کیے گئے جو خود آئین کی خلاف ورزی تھے۔ ایک طرف ملکی آئین میں سب شہریوں کو برابری کا درجہ دیا گیا تو دوسری طرف ملکی صدر کے لیے مسلمان ہونا لازمی قرار دے کر اور بھٹو صاحب کی حکومت میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا۔ رہی سہی کسر جنرل ضیاالحق کے دور آمریت میں سخت گیر قانون کی شکل میں پوری کی گئی۔ ایسی تمام قانون سازی ملکی آئین کے اس بنیادی نکتے متصادم ہے جس کے تحت تمام شہریوں کو برابری کا درجہ دیا گیا ہے۔ اسی طرح سے وہ قانون سازی حقوق کے عالمی چارٹر کی بھی خلاف ورزی ہے۔

اس پس منظر میں 1971ء کے آئین کے آرٹیکل ۵۲[۱] میں اس طرح کہا گیا ہے کہ، "قانون کی نظر میں سب شہری برابر ہیں اور وہ قانون کے ذریعے تحفظ کے حقدار ہیں۔" اسی طرح ایک آئین کے آرٹیکل میں ہر شہری کو اپنے مذہب کی تشہیر اور اس پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی ہے۔

آئین میں ایسی باتیں جلی حروف سے لکھی جانے کے باوجود بدقسمتی سے ملک میں مذہبی اقلیتوں سے نامناسب برتاؤ عام ہے۔ ایسا برتاؤ ریاستی ادارے بھی کرتے ہیں اور شہریوں کے خصوصی حلقے بھی اور دونوں صورتوں میں اقلیتی شہریوں کو تحفظ ملنا مشکل رہا ہے۔ سندھی ہندوؤں پر ہونے والا جبر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ سندھ میں ہندوؤں سے جاری اس روش کے پیچھے سیاسی مفادات بھی شامل ہیں۔ تقسیم کے دوران سندھیوں کو سب سے بڑا نقصان ہندوؤں کی نقل مکانی سے ہوا۔ ایک طرف بڑی تعداد میں ہندو آبادی کی نقل مکانی اور اس سے بھی بڑی تعداد میں ہندستان سے ہجرت کرنے والوں کی سندھ میں آبادکاری سے سندھیوں کو ثقافتی اعتبار سے بڑا نقصان اُٹھانا پڑا تو دوسری جانب سندھی سماج میں ریڑھ کی ہڈی کا کردار ادا کرنے والا متوسط طبقہ اچانک غائب ہوگیا۔ یہ ایک خطرناک سماجی خلا تھا جس کے سنگین سیاسی اثرات سے سندھ آج تک باہر نہیں نکل سکا۔ تقسیم کے وقت کراچی کی آبادی ساڑھے چار لاکھ کے قریب تھی۔ جس میں ۱۵ فیصد باشندے ہندو تھے۔ 1951ء کی مردم شماری کے مطابق کراچی کی آبادی چار سالوں میں بڑھ کر ساڑھے گیارہ لاکھ بن گئی جس میں ہندو صرف دو فیصد رہ گئے تھے۔ ہندوؤں کی نقل مکانی سے

کراچی میں سندھی بولنے والی آبادی اچانک اقلیت میں تبدیل ہوگئی۔ تقسیم سے پہلے کراچی میں سندھی بولنے والوں کا حصہ 61.2 فیصد تھا۔ مگر 1951ء کی مردم شماری میں یہ تعداد کم ہوکر 6.3 ہوکر رہ گئی۔ اسی طرح ہندوؤں کی نقل مکانی سے سندھی عملی طور پر کراچی میں ایک معمولی اقلیت بن گئے اور آج تک سندھی کراچی میں اقلیت میں ہیں۔

1998ء کی مردم شماری کے مطابق سندھ میں ہندو آبادی تقریباً 20 لاکھ تھی۔ جو کہ اس وقت کی سندھ کی آبادی کا تقریباً 6 فیصد حصہ بنتی ہے۔ یاد رہے کہ 1998ء کی مردم شماری میں سندھی بولنے والوں کا تناسب صوبے کے اندر تقریباً 60 فیصد تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سندھی آدمی اپنی دھرتی پر اقلیت میں تبدیل ہونے سے صرف ۱۰ فیصد کے فاصلے پر تھا۔ جس میں ساڑھے 6 فیصد ھندو سندھی اھم توازن کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر اتنے بڑے تعداد میں ہندوؤں پر زمین تنگ کر کے ان کو سندھ چھوڑنے پر مجبور کیا جائے تو پھر سندھی آدمی اپنی دھرتی پر اقلیت بننے کے قریب پہنچ جائیں گے۔ اس وقت سندھیوں کو کم تعداد میں دکھانے کے لیے مردم شماری کے اعداد و شمار میں تمام بڑے ھتھکنڈوں سے کام لیا جانے کا سوچا جاتا ہے۔ جو کہ بہت آسان کام نہیں ہے۔ اگر دو تین سالوں کے اندر ہندوؤں کی بڑے تعداد کو سندھ سے نکالا جائے تو پھر اُن قوتوں کے لیے مردم شماری میں معمولی شعبدہ بازی سے بھی سندھیوں کو اقلیت میں دکھانا آسان ہوجائیگا۔

تقسیم کے بعد اتنے مُنظم طریقے سے ہندوؤں کی نقل مقانی کے لیے کارروائیاں پہلے نظر نہیں آتی تھیں، بہت کم ھندو خاص طور پر خفیہ ھاتھوں، پیروں کی گادیوں اور ٹاسک پر لگائے گئے ڈاکوؤں کے ھاتھوں تنگ ہوکر نقل مقانی کرتے رہے ہیں۔ مگر پچھلے کچھ سالوں کے اندر ان کو منظّم طریقوں سے نشانہ بنا کر دھرتی چھوڑنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔ ایسا سب کچھ اتفاق سے نہیں ہورہا ہے۔ حکومت کو یہ سازش تب نظر نہیں آرہی تھی جب ایک ماہ میں ھندو برادری کی تین لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کا مذہب تبدیل کر کے ہتھیاروں کے زور پر ان کو اپنے خاندانوں سے الگ کیا گیا۔ ایسی کارروائی کرنے والے لوگ کیا اتنے طاقتور ہیں کہ قانون اور انصاف کا اجراء کرنے

والے سارے ادارے ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ رحمان ملک کو چاہیے کہ اگر وہ حقیقت میں ہندوؤں کے ملک سے نقل مقانی پر متفکر ہیں تو پھر اس سازش کے جانے پہچانے ذمہ داروں کے نام ظاہر کرے اور قانون کے مطابق برتاؤ کرے۔ باقی ٹی وی کیمروں کے سامنے مجبور اور محکوم ہندوؤں سے جھوٹے بیان دلوانے اور نعرے لگوانے سے نہ حقیقتوں کو جھٹلایا جاسکتا ہے اور نہ ہی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

پیپلز پارٹی بینظیر بھٹو کے دور میں سیکولر اور لبرل جماعت کے طور پر پہچانی جاتی تھی۔ اس نے قریب ماضی میں اپنی اس پہچان کو نظر انداز کیا ہوا ہے۔ سلمان تاثیر کے قتل کے بعد اسمبلی میں اس کے روح کو ثواب پہنچانے کے لیے دعا کرانے کی توفیق بھی پارٹی کو نصیب نہ تھی۔ اسی طرح شہباز بھٹی کے قتل کو جس طرح خاموشی سے بھایا گیا اور شیری رحمان کو انتہاپسندوں کی جانب سے دھمکیاں ملنے پر جس طرح کا سرد رویہ رکھا گیا۔ اس نے واضح کر دیا کہ اسٹیبلشمنٹ مخالف پہچان کی طرح پیپلز پارٹی اپنی لبرل اور سیکولر جماعت ہونے والی پہچان بھی آہستہ آہستہ کھو رہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سندھ میں ہندوؤں کے خلاف زیادتیوں میں ملوث اپنے اسمبلی میمبر کے خلاف بھی پارٹی کوئی واضح اقدام نہ کرسکی۔ اُس صورتحال نے ہی سندھی ہندوؤں کو بیوارثی کا احساس دلا کر دھرتی چھوڑنے پر مجبور کیا ہے۔ سندھ اور بلوچستاں دونوں صوبوں میں پیپلز پارٹی کی حکومت ہے اور دونوں صوبوں میں ہندوؤں کے اغوا کے واقعات میں خطرناک اضافہ ہوا ہے۔ مگر صوبائی حکومتیں ماسوائے بیانات جاری کرنے کے کوئی بھی واضح اقدام نہیں کر رہی ہیں۔ ویسے تو اغوا برائے تاوان کا کاروبار بن جانے کی سبب ہر مذھب اور رنگ نسل کا آدمی اس کا شکار ہو رہا ہے۔ مگر خوشحال متوسط طبقے سے تعلق کی وجہہ سے ہندو اس کا زیادہ شکار بن رہے ہیں۔ یہ ہی سبب ہے کہ عدم تحفظ کا احساس، پڑوسی ملک میں پناہ اور شہریت ملنے کی سہولت موجود ہونے کے وجہہ سے وہ ملک چھوڑ کر جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر حکومت واقعی دل سے چاہتی ہے کہ ہندو ملک چھوڑ کر نہ جائیں تو پھر وہ صرف سازشیں ہونے کے بیانات جاری کرنے کے بجائے اغوا

برائے تاوان کے کاروبار کو بند کروائے اور ہندو لڑکیوں کے اغوا میں ملوث گروہوں کے خلاف قرار واقعی اقدام کرے۔ یہ سب کچھ صرف نام نہاد قومی میڈیا سے خبریں نشر ہونے کے ردعمل تک محدود نہیں ہونا چاہیے کہ کمیٹیاں بھی صرف دورے کرنے اور میٹنگیں کرنے تک محدود نہ ہوں۔ ہندوؤں کے تحفظ کے لیے فوری طور پر جبری شادی کروانے اور مذہب تبدیل کرنے والے معاملات پر قانون سازی ہونی چاہیے۔ جیسا کہ ہندو آبادی کو تحفظ کا احساس مل سکے۔ اسی طرح ہندوؤں کے اغوا میں ملوث مجرمان کو طاقتور عناصر کی سرپرستی حاصل ہے۔ جن کے متعلق حکومت بیخبر نہیں۔ صرف سیاسی جرات کی ضرورت ہے۔ یہ بات ذھن میں رکھنی چاہیی کہ ہندوؤں کا اس طرح ملک چھوڑ کر جانا سندھیوں کہ لیے تو خطرناک ہے ہی مگر اسی طرح سے اس وقت عالمی برادری کے سامنے ملک کی پہلے ہی بگڑی ہوئی حیثیت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ ہندوستانی میڈیا ایسے مواقع کو ہاتھوں سے کیسے جانے دے گا۔ جس کو سنجیدگی سے حل کرنے کی ضرورت ہے۔ انسانی حقوق اور خاص طور پر اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے ملک کی پہچان کو بچانا خود حکمرانوں کی بھی ضرورت ہے۔

15 اگست 2012ء

خوشحالی کے جزیرے

اخباری رپورٹروں کے مطابق، جائیداد کے کاروبار میں اہم نام ملک ریاض کے بحریہ ٹاون اور ایک آمریکی سرمایہ کار گروپ نے 11مارچ کو 15سے 20 بلین ڈالر کی لاگت کے ایک یاداشت نامے پر دستخط کیے ہیں۔ پروجیکٹ کے تحت، بحریہ ٹاون، باہر کی کمپنیوں بشمول سرکردہ آمریکی سرمایہ کار تھامس کریمر، دنیا کی سب سے بڑی عمارت اور کچھ مزید پراجیکٹس کراچی بندرگاہ کے ساتھ تعمیر کریں گے۔ بحریہ ٹاون کے ترجمان نے اس پراجیکٹ کو، بوڑھے جزیرہ نما شہر کے نام سے پکارا۔ جو کہ پانچ سے دس سالوں کے دوران تعمیر کیا جائے گا۔ اس میں نیٹ سٹی، ایجوکیشن سٹی، ہیلتھ سٹی، پورٹ سٹی اور دوسرے کلیدی پروجیکٹز شامل ہیں۔ اس جزیرہ نما میں جدید طرز کا شاپنگ مال بھی تعمیر کیے جانے کا منصوبہ ہے۔

رپورٹ کے مطابق، جزیرے نما سٹی کو کراچی سے چھ لین- برج کے ساتھ منسلک کیا جائے گا۔ کراچی بندرگاہ کے ساتھ واقع دو جزیروں بندل اور بُڈو جن کو مقامی طور پر بندار اور ڈنگی کے ناموں سے پکارا جاتا ہے پر تعمیراتی کام شروع کرنے کے لیے ملک ریاض نے سندھ حکومت سے اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے کوششیں بھی کی ہے۔ سندھ حکومت ایک بڑے اثر رسوخ رکھنے والے شخص کے سامنے انتہائی شدید دباد کا شکار تھی کہ وہ اجازت نامہ جاری کردے یا خاموش رہے۔ ان جزیروں کی اکیلی خودساختہ مالک، پورٹ قاسم اتھارٹی نے بظاہر ان جزیروں کو بحریہ ٹاون کے تعمیراتی پروجیکٹز کے سلسلے میں بیچ دیا ہے۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا کہ ان جزیروں کو بیچا گیا ہو۔

پچھلے دور حکومت میں، سندھ کے سابقہ وزیر اعلیٰ، ڈاکٹر ارباب رحیم نے ان جزیروں کو ذبئ سے تعلق رکھنے والی جائداد کی ایک کمپنی کو بیچنے کی کوشش کی تھی۔ ایمار نے اربوں بلین ڈالر خرچ کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ایمار کو اس پراجیکٹ میں 85 فیصد حصہ دیا گیا تھا۔ کہ وہ 13 سالوں میں ماڈل سٹی تعمیر کرے گی۔ پورٹ قاسم اتھارٹی کو 15 فیصد رعایت دی گئی تھی کہ وہ پروجیکٹ کے لیے زمین مُہیا کرے گی۔ اس گورکھ دھندے کو اتنا خفیہ رکھا گیا کہ شروعات میں وزیر اعلیٰ سندھ نے بذات خود کہا کہ وفاقی حکومت نے اس معاملے پر سندھ حکومت کو اعتماد میں نہیں لیا۔ اور مزید یہ کہ اس کی حکومت اس معاملے پر وفاق سے گُفت وشنید کرے گی۔ اگرچہ سندھ حکومت اس بات پر اڑی رہی۔ سول سوسائٹی اور ماحولیاتی گروہوں نے اس متنازعہ پراجیکٹ کی شدید مذمت کی۔ آگے چل کر عوام کو بتائے بغیر اس اسکیم کو ختم کر دیا گیا۔

اوپر بیان کیے گئے جزیرے دراصل ایک بڑے جزیرے کے دو اختتامی مرکز ہیں جن کو مقامی زبان میں ڈنگی [جو کہ مغرب کی جانب واقع ہے] اور بنڈار جو کہ مشرق کی طرف واقع ہے۔ عالمی اداری تحفظ بقاءِ ماحولیات آئی یو سی این کی "پاکستانی حصوں کے اہم ترجیحاتی علاقوں پر مشتمل جامع رپورٹ کے مطابق، یہ جزیرہ بندل/کھپرانوالا/مچھکا جزیروں پر مشتمل جزیرہ نما ہے، جو کہ عالمی اداری تحفظ بقاءِ ماحولیات کے اہم ترجیحاتی علاقوں میں شامل ہے۔ یہ جزیرہ نما، 17,850 ہیکٹر زعلاقے پر پھیلا ہوا سندھ کے ساحلے علاقے کے مغربی اختتام پر واقع ہے۔ اس کی حدود کورنگی، فیٹی اور جھری کریکس سے ملتے ہیں۔

سندھ کے ساحل پر آٹھ کلومیٹر تک محیط بندل جزیرہ سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ جزیرے کا رقبہ اس طرح ہے کہ یہ چار کلومیٹر شمال کی جانب اور ایک کلومیٹر جنوب کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ یہاں ساحل پر ریت کے بنتے اور ٹوٹتے گھروندے ہوتے ہیں۔ اُن میں سے بیشتر تین میٹر اونچائی تک جا پہنچتے ہیں۔ جزیرہ کا شمالی حصہ گہرے پانی سے گھرا ہوا ہے جبکہ انتہاء شمالی حصے میں مینگروز کی موٹی تہیں ہیں۔ مشرقی ساحل، ریت کے تودوں سے ڈھانپا ہوا ہے۔ یہ ٹھہراؤ اور بوٹ کے لیے

کارآمد ہے۔ ساحل کے جنوب میں، گیلے اور خشک ریت کے حصوں نے ایک اور جزیرہ بنام بُڈو [ڈنگی] کو تخلیق کیا ہے۔ جو کہ اس سلسلے کا آخری جزیرہ ہے۔

جزیروں کی مالکیت

سندھ حکومت نے جب دعویٰ کیا کہ اس ایریا کو پورٹ قاسم اتھارٹی کو لیز پر نہیں بیچا گیا تب ان جزیروں کی ملکیت متنازعہ ہوگئی۔ اس طرح پورٹ قاسم اتھارٹی کو پورٹ سے متعلقہ آپریشنز کے لیے دیے گئے علاقے میں بھی یہ جزیرے شامل نہیں ہیں۔ جب کہ سابق وزیراعظم شوکت عزیز اکتوبر 2006ء کو اپنے کراچی کے دورے میں اس زمین کو پورٹ قاسم اتھارٹی کا حصہ قرار دے چکے ہیں۔ کراچی شہر کی ضلعی حکومت نے بھی جزیروں پر حق ملکیت کا دعویٰ کیا ہوا ہے۔ 8 اکتوبر 2002ء کی ایک اخباری رپورٹ کے مطابق کراچی شہر کی ضلعی حکومت اور چار صنعتکاروں بشمول تھاء لینڈ کی ایک فرم نے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے تعمیراتی پروجیکٹ بنانے کے ایک یاداشت نامے پر دستخط کیے ہوے ہیں۔ کراچی جزیرہ نماسٹی کراچی بندرگاہ کے سامنے، تین سو ایکڑ زمین کی ایراضی پر تعمیر پانے والا منصوبہ ہے۔ عالمی امداد کے اداروں اور صنعتکاروں کے تعاون کے سبب اس منصوبے کو کراچی میں ٹیکنالوجی کی عالمی ضروریات اور ٹیکنالوجیکل اداروں کی معاونت کے لیی اہم پیش رفت کے طور پر دیکھا جارہا ہے۔

اس ڈوڑ میں پورٹ قاسم اتھارٹی اہم کھلاڑی ہے۔ پورٹ قاسم اتھارٹی کے خیال میں بندل جزیرہ لکیوڈ نیچرل گیس کے ٹرمینل کی تعمیرات کے لیی بہترین جگہ ہے۔ پورٹ قاسم اتھارٹی کی جانب سے جاری کردہ ایک بیان میں جاپانی اور کورین کمپنیوں کے ایک مشترکہ گروپ نے بندل جزیرہ پر ایسے ہی ایک ٹرمینل کی تعمیر میں دلچسپی ظاہر کی ہوء ہے۔ اس کے ردعمل میں سندھ حکومت نیشد یدردعمل کا اظہار کیا اور علاقے کے مالکانہ حقوق کو چیلنج کیا۔ بغیر کسی اجازت کے پورٹ قاسم اتھارٹی نے یہاں کی ۲،۷۰۰ ایکڑ زمین، پاکستان نیوی کو بھی الاٹ کی ہوء ہے۔ اگرچہ پاکستان نیوی نے بعد میں یہ سہولت آرمرا میں حاصل کرلی مگر یہاں ان کو جو زمین ملی تھی اس کے لیے ان

کی مالکیت کی دعویٰ برقرار ہے۔ سندھ حکومت مسلسل ان جزیروں کی ملکیت کا دعویٰ کرتی چلی آرہی ہے۔، 23 فروری 2006 کو، گورنر ہاؤس سندھ میں منعقدہ ایک اجلاس میں سینئر ممبر بورڈ آف رو ینیو نے کہا کہ یہ جزیرہ نما سندہ حکومت کی ملکیت ہے۔ اس کے بیان کے مطابق جب پورٹ قاسم اتھارٹی معرض وجود میں آیا تو اس کے کام کرنے کیا صول بھی واضع کر دیے گئے تھے۔ جس میں بندل جزیرہ ان کی حدود میں شامل نہیں۔ صوبائی محکمہ قانون کے مطابق وفاقی حکومت کو دی گئی زمین صوبائی حکومت کی ملکیت تھی۔ کلفٹن کے ساحل پر واقع زمین کے متعلق ڈیفنس ہاوسنگ اتھارٹی اور سندھ حکومت کے تنازعے پر سندہ ہائیکورٹ نے اپنے عدالتی فیصلے میں سندہ حکومت کے موقف کی حمایت کی ہے۔ پاکستان کا آئین بھی اس معاملے میں سندہ کے موقف کی تائید کرتا ہے۔ آئین کے مطابق، "صوبے میں واقع، کوئی بھی ملکیت جس کا کوئی قانونی مالک نہ ہو، وہ صوبائی حکومت کی ملکیت ہوگی۔ اور دوسری صورت میں وفاقی حکومت کی ملکیت ہوگی۔

جزیروں کی ماحولیاتی خصوصیات

جزیروں کی اہم ماحولیاتی خصوصیات کی وجہہ سے عالمی انجمن تحفظ ماحولیات آئی یوسی این نے ان کو اہم ترجیحاتی علاقوں کی لسٹ میں شامل کیا ہوا ہے۔ عالمی انجمن تحفظ ماحولیات آئی یوسی این ی" پاکستانی حصوں کے اہم اور ترجیحاتی علاقوں "پر مشتمل جامع رپورٹ کے مطابق، ان جزیروں کی 10,000 ھیکٹر اراضی مینگروز سے ڈھکی ہوء ہے۔ جو کہ چھوٹی مچھلیوں اور جھینگوں کی افزائش کے لیے ماحولیاتی تحفظ فراھم کرتی ہے۔

بندل جزیرہ سبز کچھووں کی افزائش کے لیے بہترین جگہہ ہے۔ اس جزیرے کے ریتیلے ساحل واحد علاقے ہیں جہاں بےضرر سبز کچھوے شکار کی تلاش میں آتے ہیں۔ موچھکا جزیرے پر واقع رتو کوٹ کا قدیمی قلعہ [دو جزیروں کے قریب] سیاحت کے لیے دلچسپی کا باعث بن سکتا ہے۔ یہ سندہ کی قدیم تاریخ کا حصہ ہے اور اگر اسے آباد کیا جاۓ تو دلچسپ تاریخی مقام اور سیاحوں کی دلچسپی کی جگہ بن جائی گی۔ مقامی مچھلی فروش آبادی اپنی روزی روٹی کے لیی ان جزیروں پر انحصار

کرتی ہے۔ساحلی بستیوں کی 2500 آبادی میں سے، 80 فیصد مچھلی ان پانیوں میں ہے۔ چاروں اطراف کا گہرا پانی ڈولفن مچھلیوں کے دو اقسام [ھمپیک اور بوٹل نوز] کے لیے جینے کا سامان مُہیا کرتا ہے۔ یہ علاقہ انڈس فلائی وے کے ساتھ منسلک ہے۔اسی لیے یہاں کیمقامی اور موسمیاتی پرندوں کے لیی اہم غذائی آماجگاہ ہے۔حیاتیاتی تنوع کیکنوینشن [سی بی ڈی] کے مطابق ،فطرت کے اس شاہکار خزانے کا تحفظ ہمارا فریضہ بن جاتا ہے۔کنوینشن میں شامل 189 ملکوں میں پاکستان بھی شامل ہے۔حکومت نے اس کنوینشن پر عمل کرنے کے لیی ایک جامع پلان بھی بنایا ہے۔ترقی کا کوئی بھی منصوبہ جس میں محروم طبقوں کو ان کے جینے کے وسائل سے محروم کردے اس کو پائیدار ترقی نہیں کہا جاسکتا۔مینگروز کے ماحولیاتی نظام سے مزین دونوں جزیرے مچھلی کی افزائش کے لیی بہترین ہیں۔ابراھیم حیدری کی بڑی آبادی اور مچھیروں کی دوسری چھوٹی بستیاں اپنے گذراوقات کے لیے ان جزیروں کے اردگرد کم گہرے پانیوں میں مچھلیاں پکڑ کر اپنے گھروں کا چولھا جلاتے ہیں۔ڈیفینس ھاوسنگ سوسائٹیز اور کشتیوں کے لاتعداد جدید کلب کھُلنے کی سبب اُن لوگوں کے مچھلی پکڑنے کے بنیادی حقوق سلب ہوئے ہیں۔اب اس طرح کی پیش رفت سے مچھیروں کے ہزاروں خاندان اپنے گذراوقات کے تمام ذرائع کھوبیٹھیں گے۔قریب ہی مچھلی کا شکار کرنے والی 4,000 سے 5,000 کشتیاں کھلے سمندر میں کورنگی اور پیٹھی کے پانیوں سے ہوکر یہاں لنگرانداز ہوتی ہیں جو کہ جُڑواں جزیروں کے دونوں آخری حدوں پر واقع ہیں۔ جزیروں پر ترقیاتی کام کے بعد ان مچھیروں کی آمدورفت ختم ہوکر رہ جائے گی۔ یہاں یہ بات ذکر کرنا ضروری ہے کہ جب مشرف کے دور حکومت میں ان جزیروں کے متعلق ڈیل کی گئی، تو اس وقت [اب وزیر اعلیٰ] سید قائم علی شاہ اور پیپلز پارٹی سندھ کے جنرل سیکریٹری تاج حیدر نے اس معاہدے کی شدید مذمت کی تھی اور انہوں نے اس ڈیل کو، حکومت سندھ کی زمیں کے خلاف وفاقی حکومت کی سازش قرار دیا تھا۔

24 مارچ 2013ء

ضد پر اڑے حکمرانوں کو عوام کا پیغام آخر کب سمجھ میں آئے گا؟

سندھ اسمبلی سے منظور شدہ بلدیاتی اداروں کا قانون گورنر سندھ کے دستخط ثبت ہونے کے بعد مکمل طور پر ایک قانون کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ سندھ میں عام طور پر قانون سازی کے تمام مراحل کے مکمل ہو جانے کا اس طرح کبھی اعلان نہیں کیا جاتا کہ 'کوئی قانون گورنر کے دستخط ہونے کے بعد صوبے بھر میں نافذ ہو چکا ہے'۔ لیکن اس مرتبہ پیپلز پارٹی کو خصوصی طور پر ایسا اعلان کرنے کی ضرورت پیش کیوں آئی؟ ممکن ہو کہ 'خاص احکامات' کی بجا آوری کے بعد اس قانون کے مالکان کو ایسی یقین دہانی کرانا لازم ہو یا پھر سندھی بولنے والوں کے زخموں پر مزید نمک پاشی کیلئے یہ قدم اٹھانا ضروری تصور کر لیا گیا ہو! کچھ دن قبل تک تو، کچھ فریقین کا یہ خیال تھا کہ سندھ میں شدید عوامی ردعمل کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے حکومت اس قانون میں کچھ تبدیلیاں کرنے پر غور کر رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ سندھ بچاؤ کمیٹی، ادیبوں اور دیگر فریقین کو متبادل قانون کا مسودہ سامنے لانے کیلئے کہا گیا تھا۔ تاہم نئے مسودے کی بجائے اسمبلی کے منظور شدہ بل کو قانونی شکل دلوانے کے بعد اب پیپلز پارٹی کے اس عمل سے ان تمام فریقین کو یہ سمجھ جانا چاہئے کہ حکومت کی طرف سے اس قسم کی تمام یقین دہانیاں کہ قانون میں تبدیلی کی جائے گی، لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف تھیں، غرض یہ کہ پیپلز پارٹی کو اپنے طرز عمل اور تاریخی غلطی پر کوئی پشیمانی بھی نہیں۔ حکومت کا یہ فعل سندھ کے انتظامی بٹوارے کے خلاف آواز بلند کرنے والے تمام لوگوں کیلئے واضح پیغام ہے کہ 'جو چاہے کرتے رہو، ہم اپنے طرز عمل پر قائم ہیں'۔ سندھ کے لوگوں نے

بلدیاتی قانون کے خلاف جمہوری انداز سے احتجاج کیا اور سیاسی جہت سے اس بٹوارے کے خلاف اپنی ناگواری کا کھلم کھلا اظہار کیا، اس کے برعکس حکومت نے طیش دلانے والا ایسا رویہ اختیار کیا کہ جس سے یہ نتیجا اخذ کرنے میں قباحت محسوس نہیں ہوتی کہ 'مہذب اور جمہوری طور طریقے سے کی جانے والی مخالفت کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہونے والا'۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر سندھ میں رائج کئے گئے کالے قانون کے خلاف سرگرم عمل فریقین کو عدم تشدد پر مبنی عوامی جدوجہد کے ایسے طریقوں پر ضرور سوچنا ہوگا جس کی مدد سے ضد پر اڑ جانے والے حکمرانوں کو عوامی پیغام ازبر سمجھایا جاسکے۔

اب تک، سندھ کے عوام نے اس نظام کو مسترد کروانے کیلئے صوبے بھر میں ہڑتال، شہروں میں بڑے احتجاجی جلسے، جلوس، بھوک ہڑتالوں، ادیبوں اور دانشوروں کے اجتماعات اور ان کی جانب سے سرکاری ایوارڈ واپس کرنے کے اعلانات کیئے جانے جیسے طریقے استعمال کرتے ہوئے حکومت سے متواتر طور پر یہ مطالبہ کیا کہ سیاہ قانون واپس لیا جائے اور عوام کی رائے کو ملحوظ رکھتے ہوئے نیا متوازن قانون متعارف کرایا جائے۔ جمہوریت کی علمبرداری کا دعویٰ کرنے والی جماعت کے رہنما حکمرانوں کو اصولی طور پر مہذب عوامی ردعمل کے احترام میں اپنیرویے پر نظرثانی کرنا چاہئے تھی، تاہم پرامن جدوجہد کرنے والے عوام کی رائے کا احترام کرنے کی بجائے، حکومت نے ان خوشامدی فریقین کی خواہش کو اولین ترجیح دی جو بندوق کی زبان بولتے ہیں۔ سندھ بچاؤ کمیٹی اور دیگر سیاسی فریقین نے اب تک عوامی جدوجہد کے روایتی طریقوں سے احتجاج جاری رکھا ہوا تھا تاہم اٹھارہ نومبر کے دن پیر پگاڑا کی میزبانی میں ہونے والے تمام فریقین کے اجلاس کے بعد کی گئی پریس کانفرنس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب اس جدوجہد میں تیزی آئے گی۔ باوجود اس کے کہ سندھ میں مسلم لیگ (فنکشنل) کی پیپلز پارٹی کے مقابلے میں متبادل جماعت کے طور پر ابھرنے کی پذیرائی پر سوالات موجود ہیں لیکن موجودہ حالات کی ذمہ داری خود پیپلز پارٹی پر عائد ہوتی ہے۔ پیپلز پارٹی کی روزمرہ گورننس کے معاملے میں بدترین کارکردگی، سندھ مخالف قانون سازی اور اس کے بعد اختیار کئے گئے رویے نے سندھ کے لوگوں کو اس انداز

سے دیوار کے ساتھ لگایا ہے کہ سندھ کی قوم پرست جماعتیں اس اتحاد کی صف بندی کا حصہ بننے پر مجبور ہوئی ہیں جس کا رہنما کھلے الفاظ میں یہ تک کہہ ڈالے کہ 'ہمیں فوج کا ایجنٹ ہونے پر فخر ہے'۔ جب سوال قومی وحدت اور وجود کا ہو، تب مشکلات کے تپتے صحرا میں کھڑے لوگ رہنمائی یا امداد کرنے والے فرد کے حوالے سے یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے ساتھ ان کی 'دوریاں' کس طرح کی اور کتنی طویل ہیں!۔ ایسے لوگ اپنے قومی وجود اور وحدت کی خاطر کئی باتوں سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی ایسی رہنمائی قبول کر لیتے ہیں جو کہ ان کی امداد کیلئے قدم آگے بڑھائے۔ سندھ کے باسی سندھ کی وحدت سے متعلق اتنے پریشان ہیں کہ ان لوگوں کی سربراہی قبول کرنے کو بھی تیار ہیں جو کہ شستہ الفاظ میں فوج کا ایجنٹ ہونے جیسا اقرار کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ آج اس کیمپ کا حصہ بننے والی جماعتیں چند سال قبل تک پیپلز پارٹی کی مخالف نہ تھیں ، بلکہ قوم پرست جماعتوں نے تو جنرل پرویز مشرف کی آمریت کے دور میں پیپلز پارٹی کے ساتھ سندھ کے مسائل جیسا کہ: این ایف سی ایوارڈ، گریٹر تھل کینال اور کالا باغ ڈیم جیسے مسائل پر مشترکہ جدوجہد کی تھی۔ بدقسمتی سے پیپلز پارٹی ہمیشہ کی طرح اقتدار میں آنے کے بعد سندھی عوام کے مفادات اور مشکل وقت میں ساتھ نبھانے والی قوم پرست جماعتوں سے منہ موڑ کر ان عوامل کے مفادات کو پورا کرنے میں مصروف عمل ہوگئی جنہوں نے پورا ایک عشرہ مشرف کا ساتھ دیتے ہوئے اس کی آمریت میں اپنا حصہ ڈالا اور سندھ کے وسائل کو لوٹا۔ آج بلدیاتی اداروں کیقانون پر لمبی تقریریں کرنے والے اور اتحادیوں کا دل جیتنے کی خاطر تمام حدود پار کرنے والے پیپلز پارٹی کے وزراء اور ارکان اسمبلی پورے دس سال تک قوم پرستوں کے ساتھ مشرف کے انہی اتحادیوں کے خلاف زمین اور آسمان کو آپس میں جوڑنے پر تلے ہوئے تھے۔ آج پیپلز پارٹی جب مشرف کے سابقہ اتحادیوں کے ایک اشارے پر اندھا دھند قانون منظور کروا رہی ہے اور ان کی ہر فرمائش کے آگے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے تو پھر سندھ کے عوام اور سیاسی جماعتیں اور کون سی دوسری راہ کو اپنائیں؟ میں ذاتی طور پر اس خیال کا حامی ہوں کہ سندھ کے قومی حقوق کیلئے ہونے والی جدوجہد کی سربراہی روشن خیال درمیانے طبقے کے ہاتھ میں ہو لیکن پیپلز پارٹی نے خود اس مقصد کی ضمن میں ملنے والے تمام تاریخی مواقع اپنی موقعہ پرستی کی بھینٹ چڑھا دیئے۔ گزشتہ پانچ سالوں کے

درواں سندھ میں درمیانے طبقے کو میرٹ اور مواقع کے اعتبار سے اگے بڑھا کر سندھ میں کسی سماجی اور سیاسی تبدیلی کا سنگ بنیاد رکھنے کی بجائے اپنی تمام تر توانائیاں کرپشن، اقربا پروری، ٹھیکے بانٹنے، پیسوں کے عوض تقرر اور تبادلے کرنے جیسے کاموں میں صرف کئے گئے۔ سندھ سے میرٹ کا جنازہ نکالنے کیلئے سندھ سول سروسز آرڈیننس جیسے قوانین کا نفاذ کرتے ہوئے درمیانے طبقے کو دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا ہے اور پبلک سیکٹر میں ان کیلئے تمام دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ شہروں کو کوئی پیکیج دے کر ان کا بنیادی ڈھانچہ استوار کرنے یا سہولیات فراہم کرنے کی بجائے شہروں کی ترقی کے ٹھیکے بانٹیا اور اس سے اپنے اکاؤنٹ بھرنے والے کام کیئے گئے ہیں۔ سندھ کے ساتھ یہ ناانصافی تو ہر دور حکومت میں باری باری ہوتی رہی ہے لیکن پیپلز پارٹی حکومت نے اپنے آخری چھ ماہ کے دوران دو انتہائی خطرناک کام کئے ہیں، ایک ذوالفقار آباد شہر بسانے کا منصوبہ اور دوسرا بلدیاتی اداروں کے نئے قانون کا نافذ کیا جانا۔ یہ دو منصوبے سندھ اور سندھیوں کے وجود کیلئے انتہائی نقصاندہ ہیں سندھ کے باسیوں اور قوم پرست جماعتوں کیلئے یہ امر مجبوری بھی بن چکا ہے کہ وہ ہر اس فریق کے ساتھ ملکر حکومت مخالف جدوجہد کا حصہ بنیں جو ان معاملات پر کثیر الجہتی عوامی جدوجہد کرنے کی حامل اور قابل ہوں۔ اگر پیپلز پارٹی ان دونوں معاملات پر ہفتوں سے جاری عوامی جدوجہد کا احترام کرتے ہوئے، توہین آمیز اور طیش دلانے والے بیان دینے کی بجائے سیاسی تدبر سے کام لیتے عوامی ردعمل کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کرتی تو پھر سندھ کے قوم پرست ایسی کسی صف بندی کا حصہ نہ بنتے جو کہ کئی اعتراضات کی زد میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری نظر میں پیپلز پارٹی کے تکبر بھرے اور غیر لچکدار رویے کی وجہ سے ایسی صورتحال نے جنم لیا ہے اور سندھ کو اس سیاسی انتہا تک پہنچانے کی ذمہ دار پیپلز پارٹی ہی ہے۔ بدقسمتی سے انتہائی واضح اور شدید عوامی ردعمل پر پیپلز پارٹی قیادت نے سوچ بچار کرنے اور کوئی قابل عمل حل نکالنے پر غور کرنے کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے جو رویہ اختیار کیا ہے، اس کے نتیجے میں سندھ میں دیگر تمام سیاسی قوتیں اس کے خلاف متحد ہو چکی ہیں۔ اب اس اتحاد کے خلاف پیپلز پارٹی اخلاقی طور پر یہ نہیں کہہ پائے گی کہ اسٹیبلشمنٹ یا فوج نے، اس کے خلاف کوئی سازش کرتے ہوئے یہ اتحاد تشکیل دلوایا ہے کیونکہ اس اتحاد کی تشکیل کا سارا کریڈٹ پیپلز پارٹی کو ہی جاتا ہیا اور اگر اس اتحاد کی

سرگرمیوں کی وجہ سے جمہوریت یا سندھ کے طویل مدت کے حامل مفادات کو کوئی نقصان بھی پہنچا تو اس کی ذمہ داری کا ایک بڑا حصہ بھی پیپلز پارٹی کے کھاتے میں ہی ڈالا جائے گا۔ پیپلز پارٹی تمام سندھ کو ناراض کر کے ان فریقین کو خوش رکھنے میں مصروف ہے جو سندھ اسمبلی کے ہر اجلاس میں ان کے خلاف ہی واک آؤٹ کرتے ہیں اور ان کی فرمائشوں کی لسٹ طویل سے طویل تر ہوتی جارہی ہے۔ ان تمام حقائق سے حکومت لاعلم نہیں، تاہم یہ ان کی سوچی سمجھی اور خوش حواس میں اختیار کی ہوئی راہ ہے جس پر کسی نے انہیں دھکا دے کر آگے اور آگے بڑھتے جانے کیلئے نہیں کہا۔ سیاسی اتحادوں کے اندر خاص طور پر حکومت میں رہتے ہوئے مفادات کی لین دین جاری رہتی ہے اور کچھ چیزوں پر سمجھوتہ بھی کرلیا جاتا ہے لیکن سندھ کے معاملات میں پیپلز پارٹی' کچھ لو اور کچھ دو' کی بجائے صرف 'سب کچھ دینے' کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہیا اور گزشتہ پانچ سالوں کے دوران سندھ کے ساتھ بہت برا حشر کیا گیا ہے۔ مشرف جیسا آمر بھی سندھی عوام کے ردعمل کی بنا پر کالا باغ ڈیم کی تعمیر سے متعلق اپنے اعلان پر عمل سے دو مرتبہ پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن اس کے برعکس پیپلز پارٹی سندھی عوام کے ردعمل اور احساسات کا احترام کرنے کیلئے تیار نہیں۔ ایک طرف سندھ کے عوام، سیاسی جماعتیں، ادیب، صحافی وکلا اور اہل دانش لوگ ہیں تو دوسری طرف حکومت کے اتحادی ہیں۔ یہی وہ سمجھ بوجھ، فہم وفراست سے عاری پیپلز پارٹی کے فیصلوں کا نتیجہ ہے کہ سندھ میں لوگوں کے درمیان لسانی نوعیت کی خلیج مزید وسیع ہوتی جارہی ہے۔

سندھ میں ردعمل کی خاطر تمام سیاسی جماعتوں کے مشترکہ اتحاد کو ذوالفقار آباد اور بلدیاتی اداروں کے نئے قانون کی شکل میں دو اہم اشوز میسر ہیں اور حکومت مخالف سیاسی جماعتیں اگر عوامی مزاحمت کو فروغ دینے میں کامیاب ہوجاتی ہیں تو آنے والے عام انتخابات کے دوران یہ سیاسی صف بندی پیپلز پارٹی مخالف انتخابی اتحاد میں بھی تبدیل ہوسکتی ہے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس انتخابی اتحاد کو تشکیل دینے کی ضمن میں معاملات پہلے ہی سے طے ہوچکے ہوں۔ پیپلز پارٹی نیاس طرح سے اپنے قلعے سندھ کے اندر خود کو سیاسی تنہائی کا شکار کرلیا ہے۔ اس اتحاد سے سندھ کو کیا حاصل ہوسکتا ہے؟ اس نقطے پر رائے دینا قبل از وقت ہے تاہم فوری طور پر ذوالفقار آباد منصوبے

اور دہرے نظام کے حامل بلدیاتی قانون کے خلاف اس اتحاد کے پاس انتہائی وسیع سیاسی میدان دستیاب ہے۔اس اتحاد میں موجود درمیانے طبقے کی سیاسی جماعتوں کو ہر ایک قدم پر یہ ضرور دیکھنا اور پرکھنا ہوگا کہ ان کی جدوجہد اور توانائیاں صرف ہونے کا اصل مقصد سندھ کی گردن میں طوق بنا کر ڈالی گئی ان دو مصیبتوں کا خاتمہ ہونا چاہئے، اس اتحاد میں اولین ترجیح سندھ کے مفادات کا تحفظ ہونا چاہئے، نہ کہ صرف اور صرف انتخابات۔حالانکہ سندھ کے مفادات سے سچائی کی بنیاد پر اس اتحاد کو انتخابی اتحاد میں تبدیل کرنے میں کوئی خرابی نہیں لیکن اس نقطے سے متعلق تمام فریقین کو یہ بات قبل از انتخابات طے کر لینی چاہئیکہ وہ اس اتحاد کو سندھ کے عوام کی نجات کا ذریعہ بنائیں گے نہ کہ صرف اقتدار کے آخری زینے تک پہنچنے کیلئے میسر ہونے والی ایک سیڑھی۔سندھ کے دائمی مفادات، عارضی سیاسی مفادات سے بہت بالا اور معتبر ہیں اور سندھ کی نجات کیلئے طویل مدت کے حامل ایک سندھ دوست پروگرام اور عملی رویوں کی اشد ضرورت ہے۔سندھ کے مفادات کے ساتھ مخلص ہوتے ہوئے اقتدار کی سیاست کا حصہ بننے میں کوئی قباحت نہیں تاہم یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اس ملک کے اقتداری ڈھانچے میں ایسی کئی خرابیاں موجود ہیں جو کہ کمزور قوموں اور طبقات کی حقیقی نجات کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔یہ ملک کا اقتداری ڈھانچہ ہی ہے جس کی وجہ سے سندھی عوام کے مشترکہ شعور اور اتحاد سے حکومتیں قائم کرنے والی سیاسی قوتیں اقتدار کی مدت مکمل کرنے کے باوجود سندھ کے باشندوں کی خواہشات کو پورا کرنا تو دور کی بات لیکن ان کیلئے مزید عذاب پیدا کر دیتی ہیں۔

یہ اقتداری اور ریاستی نظام آئے دن اپنے وجود سے ہی نئے مسائل جنم دے کر لوگوں کو الجھائے رکھتا ہے اور ہر روز جنم لینے والے مسائل کی وجہ سے لوگوں کی توانائیاں ضائع کروا کر ان کو بنیادی مسائل اور ان کے بنیادی حل سے دور رکھ رہا ہے۔سندھ کی قوم پرست جماعتوں کو اشوز کی بنا پر قائم ہونے والے اتحادوں اور انتخابی سیاست میں سرگرم رہنے کے ساتھ ساتھ ہر ایک لمحے میں ان بنیادی سوالات پر بھی نظر رکھنا ہوگی۔اگر بے پناہ عوامی طاقت دستیاب ہونے کے باوجود پیپلز پارٹی سندھ مخالف فیصلوں پر عمل کرنے پر مجبور ہے تو اقتدار کے اس طلسمی محل سی جماعت کو حتمی

منزل یا مسائل کا آخری حل تصور کرنے کی بجائے محض ایک آپشن سمجھنا چاہئے۔ سندھ کی سیاسی بہتری کیلئے ایک کثیر الجہتی اور دوررس جدوجہد کی ضرورت ہے اور اس جدوجہد کیلئے سندھی عوام کو تبدیلی کا ایجنٹ بننے کی ضرورت ہے۔

مشرقی پاکستان کیوں علیحدہ ہوا؟

ثقافت کا عدم احترام، حق حکمرانی سے انکار، معاشی استحصال اور ترقی کا امتیازی معیار اس وقت کے مشرقی پاکستان میں عدم اطمینان کی کلیدی وجوہات تھے جو بالآخر بنگلہ دیش کی تخلیق پر انجام پذیر ہوا۔ سویلین اور ملٹری قیادت دونوں کے کوتاہ بین رویے نے مشرقی پاکستان کی طاقت کا اصل سے کم یا ناکافی اندازہ لگایا جس نے ہماری عوامی تاریخ پر ہزیمت اور شرمندگی کے گہرے نشان چھوڑ دیئے۔ جہاں حقوق کی بنیاد پر چلائی جانے والی بیشتر تحریکوں میں زبان اور ثقافت مرکزی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں، وہیں معیشت اور سیاست ہولناک شکایتوں کو دوام بخشنے میں یا قائم رکھنے میں فتنہ انگیز یا آگ بھڑکانے والے محرک ثابت ہوتے ہیں۔

ناقابل تردید طور پر، مشرقی اور مغربی پاکستان کی سماجی ساخت اور سیاسی وضع بالکل مختلف تھی۔ جہاں مغربی پاکستان میں سیاست اور معاشرے پر زیادہ تر جاگیرداروں کا غلبہ تھا، وہیں مشرقی پاکستان مکمل طور پر مختلف سماجی سیاسی منظر رکھتا تھا۔ 1857ء کے بعد برٹش راج کے تحت بنگال پہلا صوبہ بنا تھا۔ ہائی کورٹ کے دائرہ اختیار میں یہ ہندوستان کا پہلا ریگولیشن صوبہ تھا۔ بنگال کا معاشرہ اور سیاست پاکستان کے دوسرے صوبوں کے ساتھ عدم مطابقت میں بالکل مختلف تعمیراتی بلاکس پر تعمیر ہوئی تھی جہاں مخصوص نوآبادیاتی ڈھانچوں اور سماجی سیاسی فضا میں برٹش راج کا گہرا رنگ تھا۔ زمین دار اشرافیہ جس نے آج کے پاکستان کو متشکل کیا، بنگال میں 1950ء میں ہی ایسٹ بنگال

سٹیٹ ایکوزیشن اینڈ ٹیننسی ایکٹ کے متعارف کروانے پر کالعدم ہو چکی تھی۔ اس نے بنگال سے انفرادی ملکیت کو 3.3 ایکڑ فی کس یا 33.3 ایکڑ فی خاندان، جو بھی کم ہو، مقرر کر کے جاگیردارانہ نظام کو مؤثر طور پر درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ 64-1963ء کی زراعتی مردم شماری سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً 62 لاکھ فارمز میں سے 60 لاکھ فارم رقبے میں 12.5 ایکڑ سے کم تھے اور اُن میں سے بھی تقریباً 50 فیصد صرف 2.5 ایکڑ یا اس سے کم رقبے کے تھے۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان میں بڑی بڑی جاگیریں تھیں، خصوصاً پنجاب اور سندھ میں۔ مثال کے طور پر، سندھ میں 1952ء میں زمین کا 30 فیصد رقبہ زمین مالکان کے صرف ایک فیصد حصے کی ملکیت تھا اور اوسط ملکیتی رقبہ 500 ایکڑ سے زائد تھا۔ پنجاب میں زمین کے 50 فیصد رقبے پر زمینداروں کا کنٹرول تھا۔ یہ دونوں بازوؤں کے جداگانہ سماجی اور سیاسی ماحول کی نشان دہی کرتا ہے۔ چوں کہ مغربی پاکستان فیصلہ سازی کے عمل پر حاوی تھا، پرجوش اور بہادر، پختہ مزاج متوسط طبقے کی قیادت رکھنے والا مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان کی جاگیردار اشرافیہ کی طے کردہ اور نافذ کردہ پالیسیوں کی اکثر و بیشتر مخالفت کرتا تھا۔

وسائل کا بہاؤ اور مالیاتی معاملات میں مشرقی پاکستان کے خلاف امتیاز برتنا تنازعے کا بنیادی سبب تھا۔ 50-1948ء میں جب مشرقی پاکستان کا ادائیگیوں کے توازن کا بنیادی یا خالص سرپلس 62 کروڑ 20 لاکھ روپے تھے۔ مغربی پاکستان کا خالص خسارہ 91 کروڑ 20 لاکھ روپے تھا۔ اس طرح 50-1949ء سے 58-1957ء کے دوران دونوں بازوؤں کا خارجہ اور باہمی ٹریڈ بیلنس دکھاتا ہے کہ مغربی پاکستان کے 3 ارب 4 کروڑ 70 لاکھ روپے خالص خسارے کے جواب میں مشرقی پاکستان کی توازنِ تجارت کے طور پر بچت (سرپلس) 3 ارب 63 کروڑ 60 لاکھ روپے تھی۔ پہلے اور دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں یہ رجحان مستحکم رہا جب خارجہ تجارت میں مغربی پاکستان کا خالص خسارہ اور مشرقی پاکستان خالص منافع رہا، مشرقی پاکستان کا سرپلس، خسارے کو متوازن کر دیا کرتا تھا۔ غالباً اسی بات نے شیخ مجیب کو اپنے مشہور چھے نکاتی فارمولا کے تحت دونوں بازوؤں میں دو الگ کرنسیوں کا مطالبہ کرنے کی ترغیب دلائی تھی۔

اگر نفع بانٹنے میں کوئی معقول توازن قائم رکھا جاتا، اگر نفع بانٹنے کا تنازع ٹھنڈا ہو جاتا یا اس کی شدت میں کمی آ جاتی تو وسائل بانٹنے کا تنازع بھی ٹھنڈا ہو جاتا یا اس کی شدت میں کمی آ جاتی۔ ترقیاتی مواقع میں ناقابل درگزر امتیاز نے بنگالیوں کو اشتعال دلایا تھا۔ مثال کے طور پر اُس دورانیے میں مغربی پاکستان کی انتہائی منحرف/خمیدہ 3.1 فیصد جی ڈی پی گروتھ کے مقابلے میں مشرقی پاکستان کی جی ڈی پی گروتھ 2.2 فیصد تھی۔ اسی دورانیے میں مغربی پاکستان کی فی کس آمدنی میں 0.8 فیصد اضافے کے مقابلے میں مشرقی پاکستان کی فی کس آمدنی 0.1 فیصد کم ہوگئی تھی۔ اسی طور پر 55-1954ء سے 60-1969ء کے درمیان پانچ سالوں میں، مشرقی پاکستان میں جی ڈی پی گروتھ صرف 1.6 فیصد تھی یعنی مغربی پاکستان کے 3.2 فیصد کے مقابلے میں نصف۔ مشرقی پاکستان کی فی کس آمدنی میں 0.7 فیصد کمی جبکہ مغربی پاکستان کی فی کس آمدنی میں 1.2 فیصد اضافہ ہوگیا۔

تقریباً 54 فیصد آبادی رکھنے والے مشرقی پاکستان کو پبلک سیکٹر ڈویلپمنٹ میں بھی امتیاز کا سامنا تھا۔ پہلے پانچ سالہ منصوبے کے دوران مشرقی پاکستانی میں کل ریونیو اخراجات 2 ارب 54 کروڑ روپے تھے، جو مغربی پاکستان کے 8 ارب 98 کروڑ کے مقابلے میں ایک تہائی سے بھی کم تھے۔ 61-1960ء سے 65-1964ء کے دوران دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں اس کی کسی حد تک اصلاح کی گئی جب مغربی پاکستان کے 7 ارب 69 کروڑ 60 لاکھ روپے کے جواب میں پبلک سیکٹر ترقیاتی پروگرام کی مد میں مشرقی پاکستان نے 6 ارب 25 کروڑ 40 لاکھ روپے حاصل کیے، تاہم یہ ابھی بھی مقابلتاً 19 فیصد کم تھے۔ 51-1950ء سے 70-1969ء کے درمیانی دو عشروں کے مجموعی اعداد و شمار معاشی تعصب کو مزید واضح کرتے ہیں۔ مغربی پاکستان کے 61 ارب 98 کروڑ روپے کے کل ترقیاتی اخراجات کے مقابلے میں مشرقی پاکستان کے ترقیاتی اخراجات غیر متناسب طور پر 29 ارب 96 کروڑ روپے رہے۔ فی کس جی ڈی پی گروتھ ایک اور متعلقہ یا حسب حال مظہر ہے جو 60-1959ء سے 70-1969ء تک آخری دس برسوں میں اسی رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ مغربی پاکستان کی 42 فیصد فی کس جی ڈی پی گروتھ کے مقابلے میں مشرقی پاکستان کی فی کس جی ڈی پی گروتھ 17 فیصد رہی۔

نہ صرف یہ کہ مشرقی پاکستان کو اقتصادی طور پر محروم رکھا گیا اور سیاسی طور پر دبایا یا جبر کا شکار بنایا گیا بلکہ ریاستی ڈھانچے میں ان کی نمائندگی بھی کم تھی۔ سول سروس کے اعلیٰ سطحی عہدوں میں بھی بنگالیوں کے جائز حصے کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی گئی تھی۔ ملک کے پہلے پانچ سالہ منصوبے کے دوران، کئی ڈیپارٹمنٹس کے سینئر کیڈرز بنگالیوں سے بالکل خالی یا محروم تھے۔ کامرس، انٹیلی جینس اینڈ سٹیٹسٹکس، سپلائی اینڈ ڈویلپمنٹ، پیٹرولیم، پیپر اینڈ سٹیشنری ونگ، انسپکشن ونگ، جنرل کنسیشن ونگ، سینٹرل انجینئرنگ اتھارٹی، کول کمشنر اینڈ ٹیکسٹائلز کی کسی اعلیٰ پوزیشنوں پر کوئی بنگالی موجود نہ تھا۔

یہ مشرقی پاکستان سے روا رکھے جانے والے واضح امتیاز اور اقتصادی حالت کو کافی طور پر بیان کرتا ہے۔ آئینی کمیٹی کے سربراہ جسٹس شہاب الدین نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ بنگالیوں سے نوآبادیاتی رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ پیش بینی سے محروم سیاسی اور فوجی قیادت نے گہرائی سے جائزہ لینے کی بجائے سٹیریوٹائپ بیانات دینا شروع نہ کر دیئے۔ جنرل ایوب نے اپنے پاگل پن میں بنگالیوں کو ناراض کیا۔ انہوں نے ایک مرتبہ یہ کہتے ہوئے اپنی بداندیشی کا اظہار کیا: ''میں بنگالیوں کے نقطۂ نظر پر حیران ہوں۔ انہوں نے اردو زبان سے تنفر کے ذریعے خود کو مسلم ثقافت سے کاٹ لیا ہے..... خود کو ہندو ثقافت کے لیے زد پذیر بناتے ہوئے۔''

7 ستمبر 1967ء کو انہوں نے لکھا: ''اس قسم کے ہمسائے (بھارت) اور ہم وطن (بنگالی) دینے میں خدا ہم پر بہت نامہربان رہا ہے۔ ہم اس سے بدترین امتزاج کے بارے میں نہ سوچ سکتے تھے۔ ہندو اور بنگالی..... اگر بدتر صورتِ حال کا سامنا ہو تو ہم مشرقی پاکستان میں انتشار پھیلانے والوں کے خلاف سختی سے جنگ لڑنے میں بالکل نہیں ہچکچائیں گے۔ بدقسمتی سے اگر ضروری پڑی تو خون کے دریا بہا دیئے جائیں گے۔ ہم اپنے کروڑوں مسلمانوں کو ہندو غلامی سے بچانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔'' بنگالیوں کے خلاف ان الزامات میں یقیناً جنرل ایوب خان کوئی استثنا نہ تھے۔

ایسے عوامل کی تشکیل بندی نے بنگالیوں میں شدید اضطراب اور سراسیمگی کوٹ کوٹ کر بھردی۔ مسلسل جاری سیاسی تقسیم نے 1971ء میں برادر کشی کی صورت اختیار کر لی، جس کا انجام پاکستان کے بٹوارے یا تقسیم کی صورت میں نکلا۔

مذہب اور ریاست کا تعلق اور معاشرہ

ملک کے مختلف شہروں میں گزشتہ چند دنوں کے دوران جنونیت اور انتہا پسندی کے جو مناظر دیکھنے میں آئے انہوں نے ملک اور خطے کے امن پسند شہریوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔ جس طرح حکومت نے سرکاری تعطیل اور سرکاری سرپرستی میں جلسے اور ریلیاں نکالنے کا اعلان کر کے مخصوص ذہنیت رکھنے والے حلقوں کا حوصلہ بڑھایا اور جس طرح اس دن پر تمام ملک میں انتظامی مشینری بے بس نظر آئی' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنونیت ایک زہر کی طرح ملک کے رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے۔ ایک بات سمجھنی چاہیے کہ یہ واقعات اچانک رونما نہیں ہوئے بلکہ ان کی جڑیں ملکی تاریخ میں نہایت گہری ہیں۔

پاکستان میں آج کل کوئی دن فرقہ ورانہ خون خرابے کے بغیر نہیں گزرتا۔ عقیدہ کی بنیاد پر مخالفین کو ہراساں کرنا اور جان سے مار دینا معمول بن چکا ہے اور ریاست مذہبی خواہ فرقہ ورانہ اقلیتوں کو تحفظ دینے میں مکمل ناکام ہو چکی ہے۔ ملک میں اس تفرقہ کی جڑیں نہایت گہری ہیں۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت مذہبی بنیادوں پر ریاست کی بنیاد ڈالنے کے حوالے سے ابوالکلام آزاد جیسے مذہبی سکالروں نے تنبیہ کی تھی کہ مستقبل میں اس کے نتائج بہتر نہیں نکلیں گے۔ قائداعظم حالانکہ دوقومی نظریہ کے تحت علیحدہ ملک کے حامی تھے لیکن کئی مواقع پر انہوں نے اس بات کو واضح کیا کہ مسلمانوں کیلئے بننے والی ریاست مذہبی تنگ نظری کی بنیادوں پر نہیں چلائی جائے گی۔ سیاست پر

عبور رکھنے والے اس رویہ کو ان کی سوچ اور شخصیت کا اندرونی تضاد قرار دیتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ریاست بنے مذہبی بنیادوں پر لیکن وہ اپنے مزاج میں سیکولر ہو اور تنگ نظر قوتوں سے بچ سکے۔ جناح صاحب کی 11 اگست 1947ء کو معروف تقریر میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ ''آپ کا کسی بھی مذہب' ذات اور نسل سے تعلق ہو' اس کا ریاست کے امور کار سے کوئی تعلق نہیں۔'' اسی تقریر میں انہوں نے کہا کہ ''40 کروڑ افراد پر مشتمل قوم زیر تسلط ہے۔'' جناح صاحب کی اس تقریر نے انکے پیروکاروں کو بھی دکھ پہنچایا جو ان کو مسلمانوں کا راہنما اور اسلامی ریاست کا قائد تصور کرتے رہے تھے۔ معروف صحافی ضمیر نیازی نے اپنے کتاب ''دی پریس ان چینس'' میں حامد جلال کی تقریر کے حوالے سے بتایا ہے کہ اس وقت کی اسٹیبلشمنٹ نے جناح صاحب کی اس تقریر کا بلیک آوٹ کرنے کیلئے پریس ایڈوائزری بھی جاری کی تھی مگر ایک انگریزی اخبار کا اس وقت کیا ایڈیٹر الطاف حسین ان کے راستے میں رکاوٹ بنے اور کہا کہ میں براہ راست قائداعظم سے بات کروں گا۔

فروری 1935ء کو سینٹرل لیجسلیٹو اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا تھا کہ ''مذہب صرف انسان اور خدا کے درمیان کا معاملہ ہے''۔ یکم فروری 1943ء کو اسماعیلی کالج بمبئی میں اظہار خیال کرتے ہوئے جناح صاحب نے کہا ''کونسی مہذب حکومت ہوگی' جو مذہب میں مداخلت کرے گی' جو بندے اور خدا کے درمیان کا معاملہ ہے''۔ قیام پاکستان کے بعد فروری 1948ء کو امریکہ کیلئے ایک براڈ کاسٹ میں جناح صاحب کے الفاظ مزید واضح تھے'' کچھ بھی ہو جائے' پاکستان کوئی مذہبی ریاست نہیں ہوگا' جس کی قیادت مذہبی راہنما خدائی مشن سمجھ کر کریں' ہمارے پاس متعدد ہندو' عیسائی اور پارسی ہیں مگر وہ تمام پاکستانی ہیں''۔ ایسے کئی اور حوالے بھی ان کی تقریروں اور انٹرویوز سے ملتے ہیں جن میں انہوں نے پاکستان کے ایک سیکولر ریاست ہونے کا اشارہ دیا اور مذہبی اقلیتوں کی مکمل حفاظت اور ریاستی معاملات میں ان کی شراکت داری کا ذکر کیا۔ دریں اثناء ان کی کئی تقریروں میں ملک کو اسلامی شرعی اصولوں کے تحت چلانے کے حوالے بھی موجود ہیں۔ قائداعظم اس معاملے پر کسی ایک طرف واضح طور پر کھڑے نظر نہیں آتے

اس کے باوجود بھی مجموعی طور پر وہ کسی انتہا پسندی کے حامی بھی دکھائی نہیں دیتے۔ بہر حال مذہب کی بنیاد پر ملک کی بنیاد ڈالتے ہوئے یہ بات طے تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ مذہب کی حامی قوتیں اس کو اپنی مرضی سے چلانے کی کوشش کریں گی اور یہ کوشش بھی کریں گی کہ مذہب کو ریاستی معاملات کا حصہ بنایا جائے۔ قائداعظم کی وفات کے بعد یہ بات اور واضح ہوگئی اور 1949ء میں قرارداد مقاصد کے تحت لیاقت علی خان نے مذہب کو پاکستان کے ریاستی معاملات کا لازم جز بنا کر اس صورتحال کی بنیاد رکھی جس سے آج پاکستان گزر رہا ہے۔ آج کے پاکستان میں قائداعظم کی طرف سے اقلیتوں کے حقوق اور تحفظ کی یقین دہانی دور دور تک نظر نہیں آ رہی۔ نہ صرف غیر مسلم اقلیتیں اس ملک میں عدم تحفظ کا شکار ہیں مگر خود مسلمانوں کی فرقہ وارانہ اقلیتیں اسی صورتحال سے دوچار ہیں۔ مذہب کی آڑ میں انتہا پسندی کو ہوا دینے والی قوتیں اسلام کے روشن خیال یا معتدل انسان دوست تصور کے حامی افراد اور فریقین کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

قرارداد مقاصد میں پاکستان کے مذہبی ریاست ہونے کی بنیاد رکھی اور وہ دستاویز ہر آئین کا پیش لفظ بنا رہا۔ جنرل ضیاء الحق نے اس کو آئین کا باقاعدہ حصہ بنا کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں جنرل ایوب نے کوشش کی کہ ریاست سے مذہب کے معاملات کو علیحدہ کیا جا سکے لیکن مذہب کی حامی قوتیں اس وقت تک ملک پر حاوی ہو چکی تھیں۔ 1956ء کے آئین میں ملک کا سرکاری نام ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' رکھا گیا۔ 1958ء میں جب جنرل ایوب نے مارشل لا نافذ کیا تو مارشل لا آرڈیننس میں ملک کے نام میں سے ''اسلامی'' کا نام حذف کیا گیا۔ آگے چل کر 1962ء کے آئین میں بھی پہلے ملک کا نام ''جمہوریہ پاکستان'' رکھا گیا مگر جب قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس ڈھاکہ میں ہوا تو جماعت اسلامی کے ممبر بیرسٹر اختر الدین کی جانب سے اعتراض اٹھانے پر آئینی ترمیم کے تحت لفظ ''اسلامی'' کو دوبارہ ملک کے نام کے ساتھ شامل کیا گیا اور ملک کا نام دوبارہ ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' رکھا گیا۔ اس معاملے کو مزید تقویت 1973ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے نئے آئین کے ذریعے دی جب پہلی مرتبہ مختلف عہدوں کے ''حلف'' میں یہ الفاظ شامل کیے گئے کہ ''میں اسلامی نظریہ کی حفاظت کروں گا' جو قیام پاکستان کی

بنیاد ہے۔'' اس طرح ملکی آئین کو مزید مذہبی رنگ ملا۔ آئین اور ریاستی ڈھانچے کو مذہبی انتہاپسندی تک صحیح معنوں میں جنرل ضیاء الحق نے پہنچایا جس نے 1973ء کے آئین میں مختلف ترامیم کر کے ملک کو مذہبی انتہاپسندی کی طرف دھکیل دیا۔ افغان جنگ کے بعد ڈالروں کیلئے جنگ کی قیادت کرتے ہوئے ریاست کے اہم اداروں کو انتہاپسندی کے ماحول میں رنگ کر ملک کو مذہبی انتہاپسند ریاست میں تبدیل کر دیا۔ امریکہ اور مغربی ملکوں نے روس کو ایشیا سے نکالنے کیلئے اس خطے میں مذہبی ریاست کے تصور کو تقویت دی اور بدترین آمریت کی ہر طرح سے مدد اور حمایت کر کے اس جنونیت کا بیج بویا جس نے نہ صرف ایشیا مگر تمام دنیا کے امن کو خطرے میں ڈال کر رکھ دیا ہے۔

انیس سو اکتہر میں سقوط ڈھاکہ کے سانحے نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ ایک کثیر القومی ریاست کو صرف مذہبی بنیادوں پر نہیں چلایا جا سکتا۔ اس ملک کے اندر قوموں کی تاریخی شناخت اور بنیادی قومی حقوق کی مسلسل خلاف ورزی کے نتیجے میں پاکستان میں تمام مذہبی مشینری صوبوں کے درمیان تنازعے کا حل نہیں نکال سکی ہے جبکہ مذہب کی حامی قوتیں خود مذہب کے نام پر ملک کے چھوٹی قوموں کے وسائل کی لوٹ مار اور ان کے سیاسی استحصال کو تقویت دیتی رہی ہیں۔ انہیں مذہبی اکائیوں نے نہ صرف (بنگالیوں کی سیاسی اور معاشی لوٹ مار پر خاموشی اختیار کی بلکہ ان کے قومی حقوق کی تحریک کے دوران ان کے قتل عام میں برابر کی شریک رہیں۔ اسی طرح آج کے پاکستان میں سندھیوں اور بلوچوں کی واضح رائے ہے کہ مذہب کی آڑ میں ریاستی ڈھانچے نے ان کو اپنے شکنجے میں کس کر ان کا استحصال کیا ہے۔ اس تمام اہم قومی تضاد کو حل کرنا مذہبی طاقتوں کی بس کی بات نہیں۔ یہ صورتحال کوئی آج کی پیداوار نہیں لیکن جب سے یہ ملک بنا ہے تب سے چلی آ رہی ہے۔ سندھی، بلوچ اور کسی حد تک پختون قومی حقوق کی تحریکوں کو مذہبی قوتوں نے اس لیے ہمیشہ رد کیا ہے کیونکہ یہ تحریکیں اپنے مزاج میں ترقی پسند، روشن خیال اور لبرل رہی ہیں، اسی لیے مذہبی قوتوں اور ان کی حامی ریاستی قوتوں نے ہمیشہ ان کو بھارت اور روس کا ایجنٹ قرار دے کر ان کے قومی حقوق کی جدوجہد کی مخالفت کی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مذہبی قوتیں اور ان کے حامی

ریاستی ادارے ایک طرف قرارداد مقاصد کے تحت ملک کو سخت گیر مذہبی ریاست بنانے کی دلیل دیتے رہتے ہیں مگر اسی قرارداد مقاصد کی شق نمبر 9 کا حوالہ کہیں بھی نہیں دیتے جس میں کہا گیا ہے کہ ''پاکستان خودمختار یونٹوں کا وفاق ہوگا۔'' یہی نقطہ 1940ء کی قرارداد کی بنیاد تھا جس کو اب پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ قومی حقوق سے انکار نے بنگلہ دیش کو علیحدہ کیا اور اب بلوچستان میں علیحدگی کی تحریک زوروں پر ہے۔ اسی طرح سندھ میں بھی موجود وفاقی ڈھانچے سے بیزاری کا تاثر عام ہے۔ اگر دیکھا جائے تو دو قومی نظریہ کی بنیاد عملی طور پر ختم ہو چکی ہے اور ملک کو مذہب کی بنیاد پر ایک کر کے چلانے کا تجربہ ناکام ہو چکا ہے۔ ویسے بھی دنیا میں کہیں بھی کثیر القومی ریاستیں ایک عقیدے کی بنیاد پر یکجا ہو کر چل نہیں سکی ہیں۔ عرب ممالک جو نسلی اور ثقافتی طور پر ایک ہیں وہاں پر بھی مذہب ان کو متفق کر کے نہیں چلا سکا ہے۔ مذہب کی بنیاد پر جدید ریاست کو چلانا اس لیے بھی ناممکن ہے کہ خود مذہب بھی کسی ایک نظام پر متفق نہیں ہے۔ مذہب میں فرقوں کے ہونے اور ہر فرقے کی طرف سے اپنے آپ کو حق پر ہونے اور دوسرے کے غلط ہونے والے رویے کے باعث انتہا پسندی کئی روپ اختیار کر چکی ہے۔ آج کا پاکستان اس پس منظر میں ایک واضح حوالہ ہے جہاں مذہبی قوتیں محض عید کے چاند پر متفق نہیں ہو سکتیں وہاں یہ باقی معاملات پر معاشرے کو کس طرح متفق کر سکیں گی؟ اس سوال کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ مذہب' جدید ریاستوں کے تصور سے پہلے کے دور کے ہیں جن کا مقصد انسانوں کو انفرادی اچھائی کی طرف موڑ کر ایک پرامن اور بقائے باہمی پر مبنی معاشرہ کا قیام تھا۔ البتہ مذہب جیسا کہ خدا اور بندے کے درمیان کا معاملہ ہے جس کی بنیاد عقیدہ پر ہے اس لیے جدید ریاستی ڈھانچہ چلانے کیلئے کئی سوالوں کے جواب مذہبی عقیدوں سے نہیں مل سکتے۔ آج کے پیچیدہ معاشی نظام' ملکوں کے ایک دوسرے کے ساتھ مفادات کی بنیاد پر تعلقات' بین الاقوامی تجارت اور تعلقات کی نئی بنیادوں نے انسانی وسائل' مالیات اور ٹیکنالوجی کی عالمگیریت' معاشی اور سیاسی مفادوں پر بننے والے بلاکوں اور عالمی امن کے تقاضوں جیسے پیچیدہ معاملات جدید ریاست کو مذہب کے تابع کر کے چلانے سے حل نہیں کیے جا سکتے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جدید ریاست کو برابری کی بنیاد پر چلانا یا اس کے اندر کمزور طبقوں کے استحصال کو روکنا بھی اتنا آسان نہیں مگر اس وقت مذہبی معاملات کو ان سے جوڑنے کی صورت میں

معاملات مزید گھنبیر ہوجاتے ہیں۔عوامی فلاحی اور جمہوری ریاستوں نے ثابت کیا ہے کہ مذہب کو ریاستی معاملات سے جوڑے بغیر مزید پرامن اور منصفانہ معاشرہ کی داغ بیل ڈالی جاسکتی ہے جہاں حکمران اور ریاستی ادارے عقیدوں کے نہیں بلکہ عوامی خواہشات کے تابع ہوں اور کسی بھی امتیاز سے بالاتر ہوں۔

یورپ کے نشاط ثانیہ اور بعدازاں اٹھارویں صدی کے اواخر میں آنے والے انقلابات نے ثابت کیا ہے کہ ریاست کو مذہب کی بنیاد پر چلانے کے نتیجے میں عوامی استحصال کے راہیں کھلتی ہیں جن کو ایک انتہا پر آکر عوام مسترد کردیتی ہے۔فرانسیسی انقلاب کی تاریخ بتاتی ہے کہ پاپائیت' اشرافیہ اور بادشاہت کے خون چوسنے والے اتحاد نے کس طرح لاکھوں لوگوں کو انسانی درجے سے گرے ہوئے معاشریکی پستیوں میں دھکیل دیا اور ایک مرحلہ پر آکر اسی مذہب سے تعلق رکھنے والے فرانسیسی عوام نے اس نظام کے خلاف بغاوت کرکے شہنشاہیت اور پاپائیت کو مسترد کرکے جدید جمہوری اور سوشلسٹ ریاست کی بنیاد رکھی۔

بنیادی مسئلہ مذہب سے زیادہ اس کے سہارے سیاست اور ریاست کو اپنے تابع بنانے والی قوتوں کا ہے۔اگر جدید دور میں سائنسی علوم کے ذریعے سے برس کے چاند کی پیشن گوئی کی جاسکتی ہے تو ان کو مذہبی قوتوں کے تابع کرنے کا شعوری جواز کیا ہے؟!اسی طرح اگر مذہبی خیالات کے بنیاد پر لاکھوں بچوں کو پولیو سے بچاؤ کے قطرے نہ پینے دیئے جائیں اور ان کو ایک خوفناک معذوری کا شکار بننے کیلئے چھوڑ دیا جائے تو جدید انسانی سماج میں اس کو کس مذہبی تعریف کے تحت درست قرار دیا جاسکے گا؟ دس سال کے معصوم بچوں پر صرف مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے کے جرم میں سنگین الزام لگا کر علاقہ کے سینکڑوں مکینوں کی زندگیاں دا؟ پر لگادی جائیں اور ریاست بے بس بنی ہوئی ہو تو ایسے ماحول میں ریاست کو مذہب سے جوڑنیکے کتنے سنگین نتائج نکل سکتے ہیں اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔خاص طور پر اس صورتحال میں جب ملک کا اقتدار چلانے کی تقاضا کرنے والے مذہبی قوتوں کے اندر سخت گیر اور انتہاپسند رویے عام ہوں جو بچیوں کے اسکولوں کو بموں سے

اڑا اور مخالفین کی گردنیکاٹ کر وحشتناک قسم کی سزائیں دینے کے قائل ہوں ان قوتوں کے ہاتھوں میں سماج کی باگ دوڑ دینے کا تصور بھی بھیانک ہے۔ جنونیت کے اس اندھیر نے اس ملک میں لاکھوں لوگوں کی زندگیوں کو برباد کیا ہے۔ اس کو مزید پھیلنے سے نہیں روکا گیا تو یہ ملک بدترین خانہ جنگی اور خون خرابہ کا شکار ہو جائے گا۔ جنازہ نماز سے لیکر نماز عید تک تمام عبادتیں ہتھیاروں کے سائے کے بغیر ممکن نہ ہو سکنے والے ملک میں مذہبیت کو ریاستی نظام سے جوڑنے کے نتائج تصور سے کہیں سنگین برآمد ہو سکتے ہیں۔

انتہا پسندی کی بھول بھلیاں

آج کل پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یورپ کے دور جہالت سے مشابہت رکھتا ہے۔ آج کے یورپ کو ترقی کی ان منزلوں تک پہنچانے والی نشاط ثانیہ حقیقت میں رجعت پسندی پر عملیت پسندی کی فتح تھی۔ مارٹن لوتھر، کاپرنیکس، گلیلیو اور برونو نے یورپی معاشرے کو مذہبی رہنماؤں کے شکنجے سے نجات دلانے کیلئے چرچ کے اس تسلط کو چیلنج کیا جو تقریباً 1500 سالوں سے اس معاشرے کو جکڑے بیٹھا تھا۔ جب کاپرنیکس نے زمین کے کائنات کا محور کے نظریے کو غلط کہتے ہوئے سورج کو مرکزی حیثیت حاصل ہونے کا نظریہ پیش کیا تھا تو درحقیقت انہوں نے چرچ کے خود ساختہ آسمانی حکمت والے دعووں کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ اسی طرح برونو نے اس کائنات کے تسلسل بارے جب اپنا نظریہ پیش کیا تو روم کے جابر جرگے نے اس کے اوپر مذہب کے توہین کا الزام لگا کر اس کو زندہ جلا دیا۔ ایک طویل جنگ کے بعد عقل کو عقیدے پر فتح حاصل ہوئی اور سیاہ دور کی کوکھ سے نئے یورپ نے جنم لیا۔

ارادتاً حقائق کو پوشیدہ رکھنے کا رجحان عصر حاضر کے پاکستان پر حاوی ہے اور اس رجحان نے پاکستان کو سیاہ دور کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں روشن خیالی کو برداشت نہیں کیا جا رہا اور احساس برتری میں مبتلا مخصوص ذہن دلائل پر فقرے کستے نظر آتے ہیں۔ پاکستان پر مسلط اس انتہا پسندی کی جڑیں اسی دور میں گڑی ہیں جب ملک کی نظریاتی تخلیق ہو رہی تھی۔ قائداعظم کا اس

ریاست کے مستقبل بارے ویژن ایک سیکولراورترقی پسند جمہوریت اور مسلمانوں کیلئے وطن والے نظریوں کے درمیان معلق تھا۔ حالانکہ 11 اگست 1947ء کو انہوں نے اپنے پہلے صدارتی خطاب میں ریاست کے اموراور مذہب کے درمیان تعلق کے حوالے سے اپنے خیالات واضح انداز میں بیان کردیے تھے۔

قبل ازیں 1934ء میں پروفیسر تھامپسن کے لکھے ہوئے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے علامہ اقبال خود سے منسوب نظریہ پاکستان سے لاتعلقی کا اظہار کر چکے تھے۔انہوں نے واضح طور پر کہا تھا کہ وہ پاکستان کے منصوبے کے قطعی طور پر حامی نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے جونظریہ دیا تھاوہ بھارتی وفاق کے اندر مسلمانوں کیلئے ایک صوبے کا تھا۔ مولانا مودودی بھی پاکستان کی تخلیق کے سخت خلاف تھےلیکن بعد میں فوج ان کونہایت عزت وطمطراق سے نوتشکیل شدہ ریاست میں لے آئی جہاں پران کی ہم خیال اسلامی لابی پاکستان کے پاک وطن ہونے والے نظریے کے نگہبان بن بیٹھی۔ یہ رائے بھی عام ہے کہ لیاقت علی خان نے 1949ء میں قراردادمقاصد پیش کر کے نئے قائم ہونے والے ملک کی تقدیر کا رخ ہی تبدیل کردیا۔

سرد جنگ کی کوتاہ نظر پالیسیوں نے بھی پاکستان میں انتہاپسندی کو ہوا دی۔سرخ انقلاب کا خوف امریکہ و برطانیہ اور رجعت پسند عناصر کوقریب لے آیااور مغرب نے ان عناصر کوڈھیل دیے رکھی۔ بدقسمتی سے اس وقت آزادخیال اور سیکولرعناصر کوغدار قرار دیا گیااور مذہبی انتہاپسند عالمی قوتوں کے چہیتے بن گئے۔اس وقت کے امریکہ کی وزارت اطلاعات کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ وہ مخصوص اسلامی نظریات کوزیادہ سے زیادہ فروغ دیں تاکہ کمیونزم کی لہروں کے آگے رکاوٹ پیدا کی جا سکے۔ یہ تمام حکمت عملی بنانے والوں کواس وقت یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کہانی میں آگے چل کر وہ خود اس گڑھے میں گر جائیں گے جووہ اپنے ہاتھوں سے کھودرہے ہیں۔

مفادات پرمبنی ایسی پالیسیوں کے تسلسل کے نتیجے میں امریکہ اورمغربی ممالک پاکستان میں ہرنئے آنے والے آمر کی پشت پناہی کرتے ہوئے نسبتاً ترقی پسند اور آزادخیال قیادت کوکونے سے لگا کر

رکھا۔اس کی ایک بہت بڑی مثال ذوالفقار علی بھٹو ہے جس کو اپنی جمہوری اور آزاد خیال پالیسیوں کی وجہ سے پسند نہیں کیا جاتا تھا۔بھٹو کے اردگرد اس طرح گھیرا تنگ کیا گیا کہ اس کے پاس مذہبی جنونیوں کے آگے ہار ماننے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں بچا۔ان کو خوش کرنے کیلئے ذوالفقار علی بھٹو نے بہت بڑے اقدام اٹھائے جن میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینا' شراب پر پابندی عائد کرنا اور جمعہ کے روز ہفتہ وار سرکاری تعطیل کا اعلان شامل ہیں ۔ 1973ء کے آئین میں پہلی مرتبہ یہ شق رکھی گئی کہ کسی بھی سرکاری عہدے کیلئے اسلامی نظریے کے تحفظ کیلئے کوششیں کرنے کا حلف اٹھایا جائے گا جو کہ پاکستان قائم ہونے کا بنیاد ہے مگر یہ سارے اقدام سودمند ثابت نہیں ہوئے اور آج کی آزاد دنیا میں جمہوریت کے بلند باگ دعوے کرنے والوں نے ذوالفقار علی بھٹو کو مشکل وقت میں بے یارومددگار چھوڑ دیا تھا۔

سب سے بڑا ستم ضیاء الحق نے ڈھایا' انہوں نے معاشرے کی رگ رگ میں انتہاپسندی کا زہر بھر دیا۔افغانستان پر سوویت یونین کی فوج کشی اس کے ارادوں کیلئے آسمانی مدد بن کر آئی۔انہوں نے اپنے درباریوں سے مل کر اس ملک کی قسمت کو ہمیشہ کیلئے مذہبی انتہاپسندی کی گہری دلدل میں دھکیل دیا' اس دور میں انتہاپسندی اور مذہبی وفرقہ ورانہ تعصب کو ادارہ جاتی صورت ملی جس نے آنے والے عشروں میں اپنے ہی تخلیق کرنے والوں کو ڈس لیا۔

پاکستان کو افغان جنگ کیلئے متبادل میدان بنانے کے فیصلے نے اس ملک کے معاشرتی تانے بانے کی صورت ہی بگاڑ دی۔ یہاں تک کہ جنرل ضیاء الحق نے قائداعظم کے اتحاد' یقین' محکم اور تنظیم والے نعرے میں تبدیلی لاتے ہوئے ایمان' تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ کا نعرہ دیا۔'' کراسڈ سوارڈس'' کے مصنف شجاع نواز کے مطابق ضیاء الحق نے انتہاپسندوں کو پاکستان ملٹری اکیڈمی میں تبلیغ کی اجازت بھی دے دی اور تبلیغی جماعت کے مبلغ پی ایم اے میں جمعہ کا خطبہ دیتے تھے۔ آگے چل کر جنرل آصف نواز نے اس سلسلے کو ختم کیا۔ضیاء الحق نے مختلف صورتوں میں مذہب کی انتہاپسندانہ تشریح نافذ کی' انہوں نے سرعام سزا دینے کیلئے قانون سازی کی اور لوگوں کے ذہنوں کو

کمزور کرنے اور ڈرانے کیلئے ہر قسم کا طریقہ استعمال کیا۔ بڑی تعداد میں مدرسوں کا جال بچھانے کے نتیجے میں نئے نسل کے ذہنوں میں بھی رجعت پسندی کا بیج بویا گیا اور آگے چل کر اس کا پودا طالبان کی صورت میں سامنے آیا۔

کرائسز گروپ کی ایک رپورٹ کے مطابق 1947ء میں پاکستان کے اندر صرف 137 مدرسے تھے 1979ء میں یہ تعداد 1745 ہو چکی تھی جبکہ 1988ء تک یہ تعداد تیزی سے بڑھتی ہوئی 3 ہزار تک جا پہنچی' وہ سلسلہ ضیاء کے وفات کے بعد بھی جاری رہا۔ سرکاری اعداد و شمار خود یہ بتاتے ہیں کہ 2003ء میں مدرسوں کی تعداد 10 ہزار 430 تھا جبکہ ایسے مدرسے تو شمار ہی نہیں ہوتے جو رجسٹرڈ نہیں۔

افغان جنگ کے بعد ان مدرسوں کو جہادیوں کی نرسری بنایا گیا اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ آگے چل کر یہی مدرسے جہادیوں کی تربیت گاہ بھی بنے۔ مدرسوں کے تعداد میں اتنی تیزی کے ساتھ اضافہ بین الاقوامی مالی اور فنی سرپرستی کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا خواہ وہ اسلامی ہو یا سیکولر۔ جو اسٹیفنز اور ڈیوڈ بی اوٹاوے نے 23 مارچ 2002ء کو واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہونے والے اپنے ایک آرٹیکل ''دی ای بی سی آف جہادان افغانستان'' میں انکشاف کیا کہ دری اور پشتو زبانوں میں خاص نصابی کتب شائع کی گئیں تا کہ جہادی قدروں اور فوجی تربیت کو فروغ دیا جا سکے۔ یہ کتب اوماہا کی یونیورسٹی آف نبیر اسکا میں قائم سینٹر فار افغان اسٹڈی میں تیار کیے گئے تھے۔ افغان پناہ گزینوں کے کیمپوں اور پاکستانی مدرسوں میں ایک کروڑ 30 لاکھ کے قریب یہ کتب تقسیم کی گئیں۔ جہاد پاکستان کیلئے یہ ورثہ چھوڑ کر گیا۔

افغان جنگ تو ختم ہوگئی لیکن انتہا پسندی کے بارودی سرنگیں آج بھی پاکستان میں جا بجا بچھی ہوئی ہیں۔ سوویت یونین کے افغانستان سے انخلا کے بعد امریکہ کا ہاتھ سمیٹ کر ایک جانب ہو جانا بھی ایک بہت بڑی غلطی تھی جس پر امریکہ آگے چل کر پچھتایا بھی بہت ہے۔

کئی دہائیوں پر محیط انتہا پسندی کے اس نفوذ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے معاشرے میں تحمل و برداشت کا فقدان ہے اور دوسروں کے عقائد کیلئے نفرت جڑیں مضبوط کر چکی ہے۔ مذہب اور فرقوں کے ناموں پر پیدا کی گئی ان دراڑوں نے پاکستانی معاشرے کو تقسیم در تقسیم کر دیا ہے۔

ایک سہمے ہوئے ساتھی سے لیکر صف اول کے حلیف تک کے اس سفر میں پاکستانی شہریوں کو بین الاقوامی ناپسندیدہ مفادات' بدخواہ مقامی آمروں اور اساس سے متصادم مذہبی سوچ کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ انتہا پسندی کی ان بھول بھلیوں سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہا۔ سیاسی بصیرت' سماجی اصلاحات اور خوشحال معیشت اس پیچیدگی کا حل پیش کر سکتے ہیں اور اس کیلئے ملک میں جمہوریت کو تقویت دینے کی ضرورت ہوگی۔

اگر عالمی طاقتیں اس علاقے کو انتہا پسندی کے شکنجے سے آزاد کرانے کے دعوے سے واقعی مخلص اور سنجیدہ ہیں تو پھر اس کا حل پاکستان میں جمہوریت کے استحکام میں موجود ہے۔ چھ دہائیوں تک آمریت کو مسلسل آزمانے کے بعد اب آنے والی دہائیوں میں جمہوریت کو مستحکم ہونے کا موقع ملنا چاہیے۔ اس ملک کے عوام کو اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے اور پاکستان اور خطہ کو انسانیت کی آماجگاہ بننے دیا جائے۔

پیپلز پارٹی کی سیاسی تاریخ کا تجزیہ

سندھ کی تاریخ کا جب بھی سیاسی تجزیہ کیا جائے گا، پیپلز پارٹی اس کا کلیدی حصہ رہے گی. ایک ایسی پارٹی جس نے تقسیم کے بعد سندھ میں عوامی سیاست کا بنیاد رکھی اور بھٹو خاندان اپنی متضاد شخصیات کے باوجود لازوال قربانیوں کے طفیل ایک دیومالائی کردار بن کر عوام کی دھڑکنوں میں چار دہائیوں سے راج کر رہی ہے. بذات خود ملکی سیاست کا تاریخی تجزیہ کرتے وقت، ضرورت اس امر کی ہے کہ پیپلز پارٹی کو غیر معمولی مظہر کے طور پر سیاسی حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی جائے. پیپلز پارٹی کا ایسا تجزیہ تاریخی حقائق کی روشنی میں جذبات، عقیدت اور تعصّبات سے بالاتر ہوکر کرنا ؟وگا. روزنامہ جیجل کی طرف سے شروع کی گئی یہ بحث سندھ کی سیاسی تاریخ تک رسائی کی طرف ایک اہم قدم ہے.

پیپلز پارٹی کے سیاسی تجزیے کے لیے میں اسے تین ادوار میں تقسیم کرنا چاہوں گا. ایک شہید ب؟ بھٹو کا دور، دوسرا شہید بینظیر کا دور اور تیسرا بینظیر کی شہادت کے بعد کا دور. پیپلز پارٹی کی یہ تینوں ادوار ہمعصر سیاست کے ایک دوسرے سے قدرے مختلف ادوار تھے اور پیپلز پارٹی کے ان تینوں ادوار میں، اس وقت کی حقیقتوں کے پس منظر کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ویسے تو پیپلز پارٹی کا سیاسی جائزہ ایک سے زیادہ پی ایچ ڈی ڈگریوں کا مستحق ہے مگر اخبارات پڑھنے والوں کے لیے ان مضامین میں ایک مختصر تجزیہ کیا گیا ہے۔

پہلا دور: شہید ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی

ساٹھ کی دہائی میں جن حالات میں پیپلز پارٹی نے جنم لیا اس دور کے لحاظ سے وہ ایک ترقی پسند پارٹی تھیں۔ ایوبی آمریت کے آخری سال مغلیہ سلطنت کے ڈوبتے سالوں کی طرح اندرونی انتشار کے سال تھے۔ حکومتی اور انتظامی نظام آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی سحر انگیز شخصیت اور ہندستان دشمنی پر مبنی تقاریر والے انداز کی وجہ سے پنجاب کی سول اور ملٹری اسٹیبلشمینٹ کے اندر اپنے لیے قبولیت پیدا کر دی تھی۔ عوامی سطح پر مقبولیت کے لیے اس نے روٹی، کپڑا اور مکان کا زبردست نعرہ عام کیا اور نچلے طبقوں کے دلوں کو گرما دینے والی تقاریر سے ان کی دلوں میں جگہہ پیدا کر لی تھی۔ اسی طرح متوسط طبقے کے پڑھے لکھے لوگوں اور ترقی پسند قوتوں کے لیے اس نے سوشل ازم کا نعرہ لگا کر ان کی دلوں میں جگہ بنائی۔ یہی بھٹو کی شخصی ذہانت اور جاذب شخصیت تھی جس نے ایک ہی وقت فوج، پنجاب کی اسٹیبلشمینٹ، ملک کے محروم طبقوں اور آمریت سے بیزار مڈل کلاس کے پڑھے لکھے لوگوں کے ہاں قبولیت حاصل کی۔ لاتعداد تضادات سے بھرے ہونے کے باوجود اس کے پاس سب کو دینے کے لیے کچھ نہ کچھ موجود تھا۔ ایک ایسی مملکت جو جنم لیتے ہی سول اور ملٹری آمریتوں کے گود میں پلی بڑھی اور جب عوامی رائے کے حوالے سے کسی بھی چیز کے احترام کا تصور تک نہیں تھا، اس نے جمہوریت اور سوشل ازم جیسے تصورات کو عام کر کے عوام کے آنکھوں میں نئے نویلے خواب سجائے اور دلوں میں امیدوں کے لیے گرمجوشی پیدا کر دی تھی۔ یہ تو تھا بھٹو کی سحر انگیز شخصیت کا ظاہری پہلو۔ تاہم عملی طور پر بھٹو ان سب نعروں اور پروگراموں سے اتنا ربط نہیں رکھتے تھے جتنا کہ ظاہری طور پر نظر آتا تھا۔ ان کی جمہوریت پسندی کا بڑا اظہار بنگالیوں کے ملکی اقتدار پر جائز حق کے انکار کی شکل میں ظاہر ہوا۔ عوامی لیگ جو کہ پیپلز پارٹی کے مقابلے میں دگنی نشستیں لے کر قومی اسمبلی میں کامیاب ہوئی تھی اور ملکی اقتدار پر اس کا جائز حق تھا، ان کو روکنے کے لیے آرمی اور پنجاب کی اسٹیبلشمینٹ نے بھٹو کو استعمال کیا۔ بھٹو اقتدار کی خواہش اور اسٹیبلشمینٹ سے وفاداری کی دوڑ میں جمہوریت کے بنیادی اقدار کے انکاری بن گئے اور آج تک ان کا شمار مشرقی پاکستان میں ہونے والے تاریخی قتل عام کے اہم ذمہ داروں میں ہوتا ہے۔ تاریخ کے ان تلخ حقائق سے انکار ایک ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جس نے آنکھوں پر

پٹیاں باندھی ہوئی ہوں۔ بعدازاں انہوں نے ہندستان میں یرغمال 90 ہزار پاکستانیوں کو آزاد کرانے میں اہم کردار ادا کیا اور اس غلط فہمی کا شکار رہے کہ پنجاب کی سویلین اور ملٹری اسٹیبلشمنٹ اس کی غیر معمولی وفاداری کا جائز انعام دیگی۔ کوئی بھی ایماندار جمہوریت پسند اور سوشلسٹ خیالات کا شخص ایسا کچھ کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا جو بھٹو نے بنگلا دیش کے ساتھ کیا۔ 1971ء میں باقی بچے ہوئے ملک کی باگ دوڑ سنبھالنے کے بعد انہوں نے چند ایسے اقدام کئے جن پہ کچھ مقتدر قوتیں ان سے ناراض رہنے لگیں۔ ان میں بڑے پیمانے پر خانگی ملکیتوں کو نیشنلائیز کروانا، اسلامی بلاک کو آگے لے کر چلنا اور زمینی اصلاحات شامل تھے۔ اگرچہ ایسے اقدامات بھی اندرونی کمزوریوں کا شکار تھے مگر پھر بھی ہمعصر سیاسی ماحول میں یہ غیر معمولی اقدامات تھے۔ اسٹیبلشمنٹ اور آرمی سے وفاداری کرتے ہوئے بھٹو نے ایک اور دل دکھانے والا کام بلوچستان میں آرمی آپریشن کا کروایا۔ نیشنل عوامی پارٹی [نیپ] کی حکومتیں توڑ کر جمہوریت کے بنیادی روح سے انکار کیا۔ 1973ء کا آئین جس کو ملکی تاریخ کا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے، اس میں قوموں کی تاریخی پہچان سے انکار کیا گیا اور غیر مسلم کے لیے صدر بننا غیر قانونی قرار دیا گیا۔ اسی طرح جب مذہبی قوتیں اس کے خلاف ہوئیں تو اس نے قادیانیوں کو کافر قرار دینے، جمعہ کو عام تعطیل قرار کرنے اور شراب پر پابندی لگا کر ان کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ اتنی ڈھیر ساری وفاداریوں اور خدمات کے باوجود مذہبی قوتوں اور فوج نے مل کر کہ بھٹو کو تختہ دار پہ لٹکا دیا اور جن 90 ہزار پاکستانیوں کو بنگالیوں کے قتل عام میں ملوث ہونے کے باوجود بھٹو نے ہندستان سے رہائی دلا کر ان کو جوابدہ ہونے سے بری رکھا ان میں سے نوے لوگ بھی بھٹو کی جان بچانے کے لیے باہر نہ نکلے۔ اس بات میں کسی قسم کا شبہ نہیں کہ جیل کے آخری دنوں میں ایک نڈر سندھی کے طور پر انہوں نے آمروں کے آگے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا اور غیر معمولی انسانی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے تختہ دار کو قبول کیا۔ بھٹو کی ذات کے تمام گناہ 4 اپریل 1978ء میں اس وقت دھل گئے جب انہوں نے ذلت کی زندگی کے مقابلے میں جراتمندانہ موت قبول کی اور پیپلز پارٹی اور بھٹو ملک میں قربانی، جرات، آمریت سے انکار اور عوام کے لیے جدوجہد کا استعارہ بن گئے۔ شاید بھٹو اپنی زندگی میں اتنے عظیم نہ تھے، جتنا کہ سولی پہ چڑھ جانے کہ بعد۔ بھٹو اقتدار کے سالوں میں بہرحال

ماضی کے پاکستان کی نسبت ایک مختلف سیاسی کلچر عام ہوا اور اگر بھٹو اپنی ذہانت کو سیاسی ایمانداری سے جوڑ کر عوامی صفوں سے ربط برقرار رکھتے تو شاید آج کا پاکستان قدرے مختلف ہوتا۔ اسٹیبلشمنٹ کے پاس بھٹو کو قبول نہ کرنے کے تین اہم اسباب تھے۔ ایک تو بھٹو مقبول عوامی رہنما تھے اور اسٹیبلشمنٹ کو یہ اندیشہ تھا کہ بھٹو چاہے ان کی کتنی بھی خدمت کرے لیکن عوام سے اس کا مضبوط رشتہ کبھی بھی اس کو عوام کے مفادات کی طرف کھینچ سکتا ہے جس سے غیر جمہوری قوتوں کا اقتدار پہ ظاہری یا خفیہ قبضہ ختم ہوسکتا تھا۔ دوسرا یہ کہ بھٹو بہرحال ایک سندھی تھے اور بنگلادیش بن جانے کے بعد سندھ اور بلوچستان میں قومی حقوق کی تحریکوں میں تیزی آ رہی تھی۔ بنگلادیش کی علیحدگی کے بعد، پنجاب کے ملکی اقتدار پہ قبضے کہ لیے ان دونوں صوبوں کے قدرتی وسائل اہم تھے۔ بندرگاہیں، تیل، گیس، کوئلہ اور دھاتوں والی معدنیات سندھ اور بلوچستان میں تھیں۔ اس لیے اسٹیبلشمنٹ کو یہ خطرہ تھا کہ بھٹو کسی وقت بھی سندھ کی قوم پرست سیاست کو ہائی جیک کر کہ اسٹیبلشمنٹ سے لڑسکتا ہے۔ تیسرا یہ کہ بھٹو بین الاقوامی امور اور سفارتکاری کے ماہر تھے اور عالمی برادری، خاص طور پہ اسلامی ملکوں میں وہ آرمی اسٹبلشمینٹ سے زیادہ مقبول تھے۔ ان کی عالمی مقبولیت بھی ملکی اسٹیبلشمنٹ کے لیے خطرہ تھی کیونکہ خارجہ پالیسی کے معاملات میں بھٹو پہ اپنی مرضی شاید وہ زیادہ دیر تک نہیں چلا پاتے۔ آمریکہ اور مغرب کی بہ نسبت چین اور روس کی جانب جھکاؤ رکھنے والے بھٹو سرد جنگ کیا ہم ترین کھلاڑیوں کو قبول نہ تھیا وراسی لیے ان کو ہٹا دیا گیا۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ساٹھ اور ستر کی دہائیوں کی پیپلز پارٹی، اگرچہ لاتعداد تضادات کا شکار تھی پر اپنے مکمل جوہر میں اس کا جھکاو اسٹبلشمنٹ کی طرف سے ہٹ کر کہ عوام کی جانب بڑھنے کے امکانات بھی موجود تھے۔ اس دور کی پیپلز پارٹی نسبتاً ایک ایسی قوت تھی، جس میں اُس دور کے تاریخی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ وہ دور بھٹو کی شہادت سے اختتام پذیر ہوا اور ملکی تاریخ میں ایک ایسا طوفان برپا کر گیا جس کے میں واضح اثرات آج تک ملکی سیاست نظر آ رہے ہیں۔ سندھ کے حوالے سے بھٹو کا دور نسبتاً بہتر دور تھا۔ اس نے کوٹا سسٹم اور لٹیرل انٹری کو متعارف کروا کر مڈل کلاس کو اہم دھارے میں شامل ہونے کا موقع فراہم کیا۔ سندھ میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کے ذریعے مڈل کلاس کی موجودہ نسل کی بنیاد بھٹو کے دور میں ہی رکھی گ ء۔ ملک بننے

کے بعد پہلی دفعہ سندھیوں کو نفسیاتی طور پر ملکی معاملات میں شمولیت کا احساس ہوا۔ سندھ میں سندھی زبان کے معاملے میں اگرچہ بھٹو شہری سیاست کا دباؤ برداشت نہیں کر پائے اس کے باوجود سندھ اسمبلی میں سندھی زبان کا بل لانا ایک اہم سنگ میل تھا۔ البتہ سندھی ادیبوں اور شاعروں کی جانب ان کا رویہ غیر ضروری طور پہ ٹکراو والا رہا۔ بہت سی سندھی رسالوں اور کتابوں پہ بندش لگائی گئی اور ادیبوں کو مخالف خیالات رکھنے کی پاداش میں جیل بھیجا گیا۔ ان معاملات میں بھٹو کی شخصیت عملی طور پہ جمہوری اقدار سے ٹکراؤ میں رہی۔ مجموعی طور پہ سندھ کے لوگوں نے بھٹو کو ایک سندھی وزیراعظم کے طور پہ داد و تحسین دی اور اس کی پھانسی کو سندھیوں پہ حملہ سمجھتے ہوئے اس کی قربانیوں کے صلے میں اب تک ان لوگوں کو بھی ووٹ دیے ہیں، جو کہ بھٹو کو قتل کرانے والی طاقتوں کے معاون رہے۔ سندھی لوگوں نے جئے بھٹو کے نعرے پہ ایسے افراد کو بھی ووٹ دیے جن کی انگلیوں پہ آج بھی بھٹو کے خون کے نشان موجود ہیں۔ مجموعی طور پہ بھٹو شہید کا دور تقسیم کے بعد ملکی تاریخ میں پہلی بار سندھیوں کا اہم قومی دہارے میں شمولیت کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک اہم سبب بنگلا دیش بن جانے کہ بعد سندھ میں قوم پرستی کے بڑھتے اثرات کو روکنا تھا۔

دوسرا دور: بینظیر کی پیپلز پارٹی:

پیپلز پارٹی کا دوسرا دور بھٹو کی شہادت سے لے کر کہ بینظیر بھٹو کی شہادت تک گنا جا سکتا ہے۔ اس دور میں پیپلز پارٹی خاص طور پہ ایک تحریک میں تبدیل ہوگئی اور اس نے آمریت کے خلاف عوامی مزاحمت کو رہنمائی مہیا کی۔ بینظیر بھٹو اور نصرت بھٹو نے ضیا کی آمریت کے خلاف عوامی مزاحمت کو شاندار طریقے سے منظم کیا۔ ایم آر ڈی تحریک کے دوران سندہ کے باشندوں نے بھٹو کی شہادت کے خلاف اپنی نفرت کا بھرپور اظہار کیا۔ بھٹو کی شہادت نے سندھ میں قوم پرستی کی ایک جدید لہر کو جنم دیا اور بدترین ریاستی تشدد کے باوجود سندھ کے لوگوں نے شاندار مزاحمتی جدوجہد کی۔ سندھ کے اندر اس تحریک کو نچلی سطح پر دوسری تنظیموں نے بھی منظم کیا، جس میں خاص طور پر عوامی تحریک کا بھی بڑا کردار تھا۔ اگرچہ قوم پرست تحریک سائیں جی ایم سید کی قیادت میں اس تحریک

سے لاتعلق رہی، جس کا ایک اہم سبب ایم آر ڈی تحریک کا سندھ کے مفادات سے زیادہ جمہوریت کی بحالی سے جُڑا ہوا ہونا تھا، جس کو قوم پرست تحریک سندھیوں کے نجات کا ذریعہ نہیں سمجھتی تھی۔ بینظیر بھٹو نے 1986ء میں واپس آ کر کہ پیپلز پارٹی کو ازِسرنو منظّم کیا، جس پارٹی کو بھٹو کے اکثر دوست کڑے وقت میں چھوڑ چکے تھے۔ بینظیر بھٹو بھی اپنے والد کی طرح ایک جاذب شخصیت تھیں اور سیاسی حوالے سے اس کی اپنی جدوجہد کے سبب یہ کہنا غلط ہوگا کہ ان کو پارٹی صرف ورثے میں ملی تھی۔ بینظیر بھٹو چاروں صوبوں میں اُتنی ہی مقبول تھیں اور مڈل کلاس کے سوشلسٹ رجحانات رکھنے والے حلقوں میں بھی اس کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ مگر اسٹیبلشمنٹ نے اس کو اتنی آشیرواد نہ دی جتنا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو حاصل تھی۔ 1988ء کے انتخابات میں اس نے زبردست عوامی حمایت سے کامیابی حاصل کی اور ملک کی پہلی خاتون وزیراعظم بن گئیں، جس نے بہت سی طاقتور قوتوں میں صف ماتم بچھا دی۔ ایک طرف ان کو ناتجربے کاری کی وجہ سے حکومتی معاملات میں اندرونی چیلینجز درپیش تھے تو دوسری طرف ملک کی مکار اسٹیبلشمنٹ نے ان کو ایک دن بھی آرام سے بیٹھنے نہ دیا۔ بینظیر بھٹو کے دور میں بھی پیپلز پارٹی ہمعصر سیاسی تقاضاؤں پر بڑی حد تک پورا اترتی تھیں۔ اس دور میں پیپلز پارٹی کی پہچان درجہ ذیل اہم حوالوں سے تھی۔

۱۔ اسٹیبلشمنٹ مخالف سیاسی طاقت جس نے چاروں صوبوں میں جمہوریت پسند اور ترقی پسند عوام کو متحرک کیا اور آمریتی طاقتوں کو للکارنے کی جرات کی تھی۔

۲۔ ایک نسبتاً ترقی پسند جماعت جس کا انحصار مذہبی انتہاپسندی اور ہندستان دشمنی پہ نہیں تھا بلکہ ایک معتدل روشن خیال قوت جو ملک میں بڑھتی ہوئی مذہبی جنونیت کی حامی نہ تھی۔

۳۔ ایک ایسی جماعت جس کا کوئی غیر معمولی انقلابی پروگرام تو مرتب نہ تھا۔ مگر وہ مجموعی طور پہ ملک کے اندر جمہوری نظام کو مظبوط کر کہ کمزور طبقوں کو آگے بڑھا سکتی تھی۔

پیپلز پارٹی اس مکمل عرصے یعنی اپنے مختصر حکومتوں کے ماسواء ۔ باقی وقت آمریتوں سے ٹکراتی رہی، ملکی ایجنسیوں سے لے کر اسٹیبلشمنٹ کے حامی گروہوں نے اس پارٹی کو مسلسل چاروں اطراف سے باندھے رکھا۔ اس عرصے میں پیپلز پارٹی کی دونوں حکومتیں اپنی مقررہ میعاد سے پہلے ہی ختم کر دیں گئیں۔ اس کا حکومتی دور کرپشن، اقربا پروری اور انتظامی نااہلی کا شکار بھی رہا۔

سندھ کے حوالے سے بینظیر بھٹو کے حکومتی ادوار نامکمل امیدوں کے دور تھے۔ دونوں بار شہروں میں سیاست کرنے والی دہشتگرد طاقتوں نے اسٹیبلشمنٹ کے اشاروں پہ بینظیر بھٹو کی حکومتوں کو گرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ سویلین اور آرمی اسٹیبلشمنٹ نے کبھی بھی اس کو ملکی رہنما کے طور قبول نہ کیا۔ سندھ میں بینظیر کی حکومتوں کے دوران بڑی مدت والی ترقیاتی اسکیمیں شروع کی گئیں مگر ان اسکیموں کو حکومتیں ختم ہونے کے بعد نواز لیگ حکومت نے بند کر دیا۔ پیپلز پارٹی کے اقتدار سے الگ رہنے کیعرصے یعنی نواز لیگ کی حکومتوں کے دوراں سندھ میں جام صادق اور عرفان مروت جیسے سندھ دشمن چہروں کو نامزد کیا گیا اور سیاسی مخالفین کے لیے زمین تنگ کر دی گ ء ۔ ی۔ حمایتیں اور ھمدردیاں بدلنے کے ماہر وڈیرے ہر دفعہ پیپلز پارٹی کو چھوڑ کر ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ پ پ مخالف حکومتوں میں شامل ہو جاتے اور بینظیر کے اقتدار میں آتے ہی ان کو بھٹو کی شہادت یاد آجاتی تھی۔ اقتدار پہ وہ ابن الوقت گروہ اس وقت بھی قابض رہا پھر بھی بینظیر بھٹو کی اپنی شخصیت سندھ میں ہمیشہ مقبول رہی۔ مکمل ناانصافیوں اور رنجشوں کے باوجود بیلوٹ پارٹی کارکن ھر وقت پیپلز پارٹی سے جڑے رہے۔ بینظیر بھٹو سانس لیے بغیر مسلسل ملکی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف جدوجھد کیصف اول کے مورچیسے برسرپیکار رہیں۔ اس دور میں بھی اگرچہ سندھیوں کو پیپلز پارٹی سے بہت شکایات رہیں جس میں شہری جماعتوں سے اس کینز دیکی، نوکریوں میں میرٹ کا مسئلہ اور کرپشن جیسے انتظامی معاملات شامل رہےلیکن مجموعی طور پر پیپلز پارٹی کو اپنے مزاحمتی کردار کے وجہ

سے مقبولیت حاصل رہی۔ بینظر بھٹو کی حکومتوں کے دوران سندھیوں کی صوبے اور وفاق میں انتظامی مُعاملات میں نمائندگی بہت بہتر ہوا کرتی تھی۔ وفاقی حکومت میں بینظیر بھٹو کے دور میں جتنے سندھی سیکریٹری ہوا کرتے تھے اتنے زرداری صاحب کے دور میں نھیں رہے۔ سندھ کی ترقی اور سیاسی حقوق کے متعلق بینظیر بھٹو کے دور میں پیپلز پارٹی کا رویہ نسبتا بہتر رہا اور سندھ کے پڑھے لکھے لوگوں سے ملک اور بیرون ملک قیام کے دوران وہ مسلسل رابطے میں رہا کرتیں تھیں تا کہ سندہ میں سماجی تبدیلی کے لیے کچھ بہتر پیش قدمی کی جاسکے۔ سندہ کے قومی سیاسی مفادات جیسا کہ کالاباغ ڈیم، این ایف سی ایوارڈ وغیرہ جیسے معاملات میں بھی پیپلز پارٹی حکومتوں سے باہر رہتے ہوءِ ے بھی ہراول دستے کا کردار ادا کرتی تھی، جس کہ لیے اس کو اسلام آباد اور لاھور میں سندہ کارڈ کا طعنہ ملتا رہتا تھا۔ کالاباغ ڈیم کے خلاف اینٹی کالاباغ ڈیم فرنٹ کی طرف سے لگائے گئے دھرنے میں بینظیر بھٹو کی ذاتی شرکت کو سندہ میں غیر معمولی اہمیت دی گئی۔ کچھ حلقوں کا یہ بھی خیال تھا کہ کل اگر اس خطہ اور ملک میں کچھ اہم اور بڑے فیصلے ہوئے تو بینظیر بھٹو سندھیوں کے قومی حقوق کے تحفظ کہ لیے اھم کردار ادا کرسکتیں تھیں۔ اس امید میں کتنی خوشفہمی اور کتنی حقیقت پسندی شامل تھی، اس کے بارے میں مختلف پہلو ھو سکتے ھیں۔ کیٹی بندر پروجیکٹ جیسی پیش قدمیوں سے ظاھر ھوتا ھے کہ بینظیر بھٹو کے دور والی پیپلز پارٹی کے پاس سندھ کے لیے ھمعصر دور کے تقاظات کو پورا کرنے کی صلاحیت اور سوچ موجود تھی۔ بینظیر بھٹو کو احساس تھا کہ سندھیوں کو منظم طریقے سے وڈیروں اور جاگیرداروں کی غلامی میں جکڑا گیا ہے اور سندھیوں کی نجات وڈیرا کلچر اور جاگیردارانہ سماجی نظام سے چھٹکارا پانے کہ سوا ممکن نہیں۔ اگرچہ بینظیر کے دور میں بھی موقع پرست وڈیرے پیپلز پارٹی میں آتے جاتے رہتے تھے مگر مجموعی طور پر پیپلز پارٹی پر وڈیروں کا قبضہ اتنا مظبوط نہ تھا اور پیپلز پارٹی کی پہچان پھر بھی کسی حد تک مڈل کلاس کی نمائندہ پارٹی کی تھی۔ سندھ کے اندر مڈل کلاس کے رھنماوں کی ایک لمبی قطار پیپلز پارٹی کی نمائندگی کرتی تھی اور نچلے طبقوں کے کارکنوں کے لیے قیادت تک رسائی نسبتا آسان ھوتی تھی۔ متوسط طبقوں کے اسمبلی میمبران اور

وزراء تب بھی کرپشن کرتے تھے مگر آج کے دور کی طرح قیادت کی جانب سے مال کمانا ان کے فرائض میں شامل نہ تھا۔ اقتدار میں زیادہ عرصہ نہ رہنے اور زیادہ وقت مخالف حیثیت میں رہنے کی وجہ سے سندھ کے قومی مفادات پر پیپلز پارٹی کا کردار بہت بہتر تھا۔ اقتدار کے مختصر برسوں میں پیپلز پارٹی مکمل طور پہ اسٹیبلشمنٹ سے ٹکراؤ میں رہتی تھیں اسے لیے مرکزی قیادت کے پاس نچلی سطح پہ ہونے والی بدعنوانیوں اور بدانتظامیوں کو سنبھالنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ پیپلز پارٹی البتہ مخالف جماعت والے ادوار میں ایک اثر پذیر مخالف قوت بن کر کے ابھرتی تھیں اور اس کا مزاحمتی کردار کافی پختہ ہوا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ کے اہم ترین مسائل جیسا کہ پانی اور آمدنی کی منصفانہ تقسیم پر مخالف جماعت کے طور پر پیپلز پارٹی وفاق میں متاثر کن کردار ادا کرتی تھی اور سندھ میں زیادہ طور پہ قوم پرست قوتوں سے مختلف کامیٹیوں میں بھی شریک کار رہا کرتی تھی۔ پیپلز پارٹی کا یہ دور اس کی مزاحمتی جوھر کے ساتھ جمھوریت کو پروان چڑھانے کے لیی مسلسل جدوجھد کا دور تھا، جو کہ بینظیر بھٹو کی شہادت سے اپنے اختتام کو پہنچا۔

تیسرا دور: آصف علی زرداری کی پیپلز پارٹی

تیسرا یعنی موجودہ دور بیتے ھوے دونوں ادوار سے قدرے مختلف ہے۔ اس سے پہلے سندھ میں پیپلز پارٹی ہمیشہ بھٹو خاندان کی رھنمائی کے بل بوتے پر سیاست کرتی تھی۔ اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ پیپلز پارٹی کی قیادت ایسے شخص کے پاس آئی، جو کہ بینظیر بھٹو کا خاوند تو ہے مگر خاندانی وراثت میں یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے آصف علی زرداری کو بھٹو خاندان کا حصہ تسلیم کرنا آسان نہ تھا اور اصولی طور پہ سیاست خاندانوں کی میراث نہیں ہونا چاہیے۔ 2008ء میں آصف علی زرداری کی پہچان ایک ایسے متضاد شخص کی سی تھی، جس پہ ایک طرف سابقہ حکومتی ادوار میں کرپشن کے سنگین الزامات تھے اور دوسری طرف بغیر ثبوت کے الزامات میں وہ سالہا سال سلاخوں کے پیچھے رہے۔ اور کسی بھی موقع پر اس نے وقت کے حکمرانوں کے آگے ہار نہیں مانی تھی۔ جو کہ سیاسی حوالے سے معمولی بات نہیں۔ البتہ 2008ء میں اس نے جس طرح ایک پُراسرار وصیت کو بنیاد بنا کر پارٹی کی

باگ ڈور سنبھالی، اس کے بارے میں بہت سے سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔ وصیت کا صحیح یا غلط ہونا ایک الگ بحث ہے۔ چونکہ ایک ایسی پارٹی جو ملک میں جمہوریت کی بقا کی جدوجہد کی دعویدار ہو، اس میں پارٹی کی رہنمائی کا تعین سیاسی اداروں کے بجائے وصیت پہ کرنا اصولی طور پہ غلط راویت ہے۔ بہرحال اس وقت جب پورا ملک بینظیر کی شہادت میں سوگوار تھا، ان سوالات پر زیادہ بحث نہ ہوسکی۔ مگر پھر بھی پیپلز پارٹی کے تیسرے دور کی شرعات غیر جمہوری انداز میں ہوئی۔ اور یہ رویہ پیپلز پارٹی کا موجودہ تعارف بنا ہوا ہے۔ اس دور میں پیپلز پارٹی ایک فرد کے فیصلوں کے ماتحت بن گئی۔ پارٹی ادارے اور کارکنان مفلوج ہوگئے اور نیچے سے اوپر تک کے پارٹی معاملات اور حکومتی امور کے متعلق سارے فیصلے آصف زرداری صاحب کے حکم کے محتاج بن گئے۔ پارٹی اجلاس یا تو ہوتے ہی نہیں یا پھر ہوتے ہیں تو وہاں حاضرین کو صرف سننے کی اجازت ہوتی ہے۔ یک طرفہ فیصلوں کا ثبوت سندھ میں دوہرے بلدیاتی نظام کو رائج کرنا اور واپس لینا ہے۔ جب کہ سندھ اسمبلی میں یہی بل پیش ہوا تو ایک بھی رکن کو یہ جرات نہ ہوئی کہ اس بل کی مخالفت میں ووٹ دے سکتا۔ اور جب سندھی عوام کی سخت مخالفت کے بعد یہ بل واپس لینا پڑا تو انہی اسمبلی میمبران نے اس بل کی مخالفت میں یک رائے ووٹ دے کر 1979ء والا نظام بحال کیا۔ پیپلز پارٹی کیاندر ذمہ دار لوگوں کی ھَمہ تن گوش خاموشی اور تنہائی اس سے پہلے کبھی بھی نظر نہیں آئی۔ پیپلز پارٹی کے سینیئر رہنما کہتے ہیں کہ بینظیر بھٹو کے ادوار میں پارٹی کے اندر اہم معاملات پر بحث بھی ہوا کرتے تھے اور بینظیر صاحبہ مختلف رہنماوں کو سنتی تھیں۔ پارٹی کے اندر کسی بھی معاملے پر اختلاف رائے رکھنے پر کوئی بھی روک ٹوک نہ تھی۔ اس کے برعکس موجودہ پیپلز پارٹی کوئی تنظیم نہیں پر کچھ افراد کے تابع چلنے والے ایک گروہ میں تبدیل ہو چکی ہے، جہاں اختلاف رائے نام کی کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں۔ اوپر کی سطح پر زرداری صاحب اور اس کے ہم خیال کچھ لوگوں کی مرضی سے مکمل فیصلے ہوتے ہیں اور باقی ممبراں کے پاس ان سے متفق ہونے کے سوا کوئی بھی چارہ نہیں ہوتا۔ کچھ پارٹی رہنماؤں نے شروعات میں کچھ اختلافِ راء کی جرات کی مگر آھستہ آھستہ سبھی لوگ اُسی بہاؤ میں بہنے لگے یا پارٹی سے جدا ہوگئے۔

پارٹی کے حوالے سے دوسرا اہم سیاسی زوال یہ آیا کہ ماضی میں اسٹیبلشمنٹ اور اس کے حامی طاقتوں سے مخالفت میں رہنے کی جرات کرنے والی پارٹی سراپا اسٹیبلشمنٹ بن گئی۔ مفاھمت کے نام پر ہر ایک جماعت اور فرد کے ساتھ بغیر حساب کتاب کے نئے رشتے جوڑے گئے، جس کا مقصد جمہوریت سے زیادہ اقتدار کو بچانا تھا۔ سندھ میں ایم کیو ایم اور وفاق میں قاتل لیگ قرار دی گئی جماعتوں سے مفاھمتیں ان کا واضح مثال ہیں۔ سیاسی نظریے اور اصول ماضی کے افسانے بن گئے۔ ویسے تو ایسی مصلحتیں بینظیر بھٹو کی حکومتوں میں بھی ہوئیں تھیں جب کراچی میں امن کی خاطر ھٹ دہرمی کی سیاست کرنے والوں کے ساتھ صلح کی گئی۔ اور ان اشخاص کو جمہوریت کے تمغے پہنائے گئے جنہوں نے برسوں سے ملک کے اندر جمہوریت کو پاؤں تلے روندرکھا تھا۔ پر بینظیر بھٹو کی حکومتیں گزری ہوئی پ-پ حکومت کے مقابلے میں بہت کمزور تھیں۔ اس کے برعکس 2008ء میں پیپلز پارٹی کو دیا گیا اقتدار گذشتہ ادوار سے زیادہ پختہ تھا کہ ایوان صدر میں آصف زرداری صاحب بذات خود موجود تھے۔ اگرچہ ان دیکھی اور دیکھی طاقتوں کی جانب سے پیپلز پارٹی حکومت کو گاہے بگاہے مختلف بحرانوں میں الجھایا گیا اور آغاز سے ہی، ہر چھ ماہ میں حکومت کے خاتمے کی تاریخوں کا اعلان ہوا کرتا تھا۔ کچھ ٹی وی چینلز اور اینکر زتو صبح وشام اس ڈیوٹی پر ہوا کرتے تھے کہ پیپلز پارٹی کی حکومت کا میڈیا ٹرائل جاری رکھا جائے۔ ایسے ماحول میں پیپلز پارٹی نے وفاقی سطح پہ اٹھارویں ترمیم، این ایف سی ایوارڈ، کاؤنسل آف کامن انٹریسٹ کی بحالی اور عورتوں کے حقوق کے متعلق انتہائی اہم قانون سازی بھی کی۔ وفاق میں پیپلز پارٹی کی حکومتی کارکردگی کچھ حوالوں سے بہتر رہی، البتہ پارٹی اداروں کی کمزوری، افراد کا فیصلہ سازی پہ کنٹرول، بجلی کے بحران اور روزمرہ کی خراب حکمرانی کی وجوہات کہ باعث پارٹی کے امیج کو نقصان پہنچا۔ پنجاب میں بجلی کے بحران کے معاشی اثرات باقی تینوں صوبوں کے مقابلے میں زیادہ سنگین ہوئے، ادھر نجی اور درمیانی صنعت پر لاکھوں افراد کی معیشت کا دارومدار ہے اور بجلی کے بحران کا پنجاب میں مطلب معاشی بحران پیدا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ صدر زرداری اور ان کے من پسند قریبی ساتھیوں کے کرپشن کے قصے تو اتنے عام ہوگئے کہ حکومت کہ متعلق بدعنوان ہونے کا تصور گلی گلی میں عام ہوگیا۔ پارٹی اداروں کی کمزوری کی وجہہ سے پارٹی کے اندر جرات مند لوگوں کے لیے کوئی بھی جگہ باقی نہ رہی اور انگلیوں

پہ گنتی جتنے لوگوں کو چھوڑ کر باقی اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کا کام صرف مال کمانا رہ گیا تھا۔ پیپلز پارٹی اسٹیبلشمینٹ کو چکمہ دینے کے لیے پانچوں سال ہی اتحادیوں کی ایسی فرمائشوں کو پورا کرنے میں مصروف رہی، جس سے اس کی سیاسی اھمیت مکمل ختم سی ہوچکی تھی۔ کراچی اور بلوچستان میں لاشیں گرنے کا سلسلہ پہلے سے بھی زیادہ رھا مگر حکومت مفاھمت نبھانے کے چکر میں مجرموں کو روکنے کے بجاء ے ان کے نہ ختم ہونے والے مطالبات پورے کرنے میں مصروف رہی۔ بلوچستان میں پیپلز پارٹی حکومت نے اربوں روپیوں کے اضافی فنڈز فراھم کیے جو کہ پارٹی رہنماؤں کی کرپشن کے بھینٹ چڑھ گئے۔ اور بلوچ عوام اسی طرح ایک طرف غربت اور بدحالی کا شکار بنا رھا تو دوسری جانب کئی گم شدہ بلوچوں کی مسخ شدہ لاش گھروں میں پہنچے۔ سندھ کے حوالے سے پیپلز پارٹی کا تیسرا دور بہت بھیانک تھا۔ سندھیوں کی حالت مشرف دور سے بھی دو قدم پیچھے چلی گئی۔ سیاسی طور پر صوبے کے اندر ایسے نقصان دہ فیصلے کیے گئے، جو کہ مشرف جیسا آمر نے بھی نہیں کیے۔ سندھ کی عوام کے لیے سندھ کی جغرافیائی وحدت سے بڑہ کر کہ کوئی بھی بات اھم نہیں مگر پیپلز پارٹی نے دو مرتبہ ایسا نظام متعارف کرایا، جس میں کراچی عملی طور پہ باقی صوبے سے جدا نظر آیا۔ حکومت کی اتحادی جماعت کراچی میں کھلم کھلا الگ صوبے کی تحریک کی پشت پناہی کرتی رھی۔ سندھی پہلے ہی عددی اقلیت میں تبدیل ہونے کی تلوار کے نیچے ھیں، ایسے حالات میں مردم شماری جیسے حساس معاملات کو بھی ایسی قوتوں کے حوالے کیا گیا، جنھوں نے اعداد و شمار کی ایسی جادوگری دکھائی کہ کوئی نابینا بھی ایسے اعداد و شمار پہ یقین نہ کرسکتا تھا۔ اوپر سے سندھ میں ذوالفقار آباد کا اعلان کرکے سندھیوں کو اپنی ہی دھرتی پر اقلیت میں بدلنے کے انتظامات مکمل کیے گئے۔ دوسری جانب سندھ میں تاریخ کی بدترین کرپشن کرکہ سندھ کے شھروں کا ڈھانچہ برباد کیا گیا۔ لاقانونیت اور اغوا برائے تاوان کو ایک نیا عروج نصیب ھوا اور سندھ کے کتنے ہی علائقے دن کی اوقات کار میں بھی گھومنے کے قابل نہیں رہے۔ کراچی کے اکثر علائقوں میں مختلف گروھوں کے ھتھیار بند ٹولے قابض ھیں۔ اور اُدھر کسی کا بھی جانا محفوظ نہیں۔ دیہات میں صنعتی جال بچھانے کے واعدے ایک انچ بھی آگے نہ بڑہ سکے۔ سندھیوں کو صرف بینظیر کارڈ کی خیرات کے ماہانہ ایک ھزار روپیے نصیب ہوئے۔ ماضی کی مقابلے میں میرٹ کی دھجیاں اڑانے کے

انوکھے مثال قائم ہوئے اور پہلی دفعہ تبادلوں اور مقرریوں میں بدعنوانیوں کو قانونی شکل دینے کے لیے سندھ اسمبلی سے مکمل قانونسازی کرائی گئی۔ سندھ میں بدترین انتظامی مشینری مسلط کرتے ہوئے دیہات کی ترقی کو وڈیروں اور درمیانی طبقے کے نومولود وڈیروں کی کرپشن کی بھینٹ چڑھایا گیا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سابقہ پانچ سالوں میں سندھ کے اندر جو بدترین حکمرانی دیکھی گئی۔ اس کی مثال ملکی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس طرح پیپلز پارٹی کا تیسرا دور سیاسی نظریے اور پروگرام کے بجائے شخصی حکومت کا دور رہے۔ پیپلز پارٹی کو بحیثیت جماعت جتنا نقصان اس دور میں پہنچا ہے اتنا پہلے کبھی بھی نہیں پہنچا تھا۔ پارٹی کی اس بصارت کا نتیجہ 2013ء کی الیکشن میں نظر آیا، جب ماسوائے سندھ کے باقی تینوں صوبوں میں پیپلز پارٹی کو عملی طور پر سیاسی شکست مل چکی ہے۔ اب چاروں صوبوں کی زنجیر کہلوانے والی ملک گیر پارٹی اپنی آخری پناہ گاہ سندھ تک محدود ہو چکی ہے۔ سندھ کے اندر بھی متبادل کی غیر موجودگی، انتظامی مشینری کی مدد سے کی گئی دھاندلیوں اور پانچ سالوں میں لوٹے ہوئے عوامی خزانے سے خرچ کیے گئے کروڑوں روپیوں نے پارٹی کو کچھ سہارا دیا ہے۔ چناؤ سے پہلے صورتحال یہ بن چکی تھی کہ پارٹی عوام کے ٹھکرائے مشرف کے دوست وڈیروں کو پیپلز پارٹی میں شامل کرنے کے لیے مفاہمتی وفد بھیجتی رہی۔ یہی وڈیرے کتنا وقت پارٹی کا ساتھ دیں گے وہ تو وقت ہی بتائے گا۔ پیپلز پارٹی تاریخ کے تیسرے دور میں عوام کی شعور اور طاقت کو سیاسی مرکز بنانے کے بجائے سیاسی چالاکیوں، موقع پرستیوں، مفاہمتوں اور مصلحتوں کو اپنی سیاسی طاقت کا مرکز بنایا ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ عوامی سطح پہ اس کی مقبولیت میں اتنی نمایاں کمی آئی ہے کہ سندھ کے اندر اکثر جیتی ہوئی سیٹوں پہ 2008ء کی نسبتاً ان کے ووٹوں کی شرح بہت کم نظر آ رہی ہے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت کو بہرحال سندھ میں ایک مزید موقع ملا ہے، دیکھتے ہیں کہ پارٹی اس موقع کو کتنی ذمیواری سے استعمال کرتی ہے۔ آنے والے پانچ سالوں میں پارٹی قیادت جو فیصلے کرے گی وہی پارٹی کے مستقبل کا تعین کریں گے۔ ایک بات تو واضع ہے کہ اکیسویں صدی کے مہذب تقاضوں کو آج کی پیپلز پارٹی مکمل نہیں کر سکتی۔ پارلیمانی سیاست آج کے دور میں غیر جمہوری جاگیردارانہ رویوں اور عوامی مفادات کے بجائے اقتداری ترجیحات پر انحصار کرتے ہر قسم کے جرم کو مفاہمت کے نام پر جائز قرار دیتے ہوئے آج کی سائنسی اور تاریخی ضرورتوں کو مکمل نہیں

کرتی۔ سندھ کے اندر روشن خیال متوسط طبقوں کو اپنے ساتھ لے چلنے کے بجائے ابن الوقت وڈیروں کے ڈیروں پر چکر کاٹنا، پارٹی پروگرام اور منشور کے بجائے روزمرہ کے مفادات کے فیصلے کرنا، اپنے سیاسی قوت کے علائقوں کی عوام کو سنبھالنے کے بجائے موقع پرست طاقتوں کے مفادات کی چوکسی کرنا، شہروں کو جدید دور کے تقاضاؤں کے مطابق انسانی رہائش کے قابل بنانے کے بجائے ان کو کھنڈرات میں تبدیل کرنا، معاشرے میں صحت مند مقابلے کے رجحانات کے لیے میرٹ اور محنت کو جگہ دینے کے بجائے شارٹ کٹ کو سرپرستی دینے والی پارٹی اکیسویں صدی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرسکی۔

اکیسویں صدی کا تعارف انسانی وقار، ترقی کے یکساں مواقع، اہلیت کی پزیرائی، صلاحیت کی ارتقا اور تاریخی حقوق کے احترام سے مشروط ہے۔ بدلتے عالمی سیاسی منظرنامے، ٹیکنالوجی خاص طور پر میڈیا کے انقلاب اور عالمی سطح پر جمہوریت اور سیکیولر اقدار کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیی پیپلز پارٹی اپنے آج کی شکل میں ان معیارات پر پورا نہیں اترتی۔ سندھی سماج کو جدید دنیا سے میلوں دور پتھروں کیعہد کی طرف دھکیل کر ماتمی نغموں اور ایک ہزار روپیوں کیامدادی پروگراموں کے عیوض ووٹ وصول کرنے والی پارٹی کس طرح اکیسویں صدی کے تقاضوں کو پورا کر سکے گی۔ جس پارٹی کی حکومت میں سندھ کی یونیورسٹیاں فارغ البال عملداروں کوفقط ذاتی وفاداریوں کے صلہ میں ملیں ہوں، جب ہزاروں کی تعداد میں بنیادی تعلیم کے اداروں کوتالے لگے ہوئے ہوں اور بدامنی متوسط طبقے کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہو، وہ پارٹی انتخابات توجیت سکتی ہے مگر اس سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ سماج کو اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ھم آہنگ کر کے کوئی باوقار مستقبل فراھم کر سکے گی۔ سندہ کو ایک ایسی پارٹی کی ضرورت ہے جو صرف انتخابات کو ایندھن کے طور پہ استعمال نہ کرے بلکہ اس کو جدید سیاسی اور سماجی تقاضوں پہ اسطوار قوم کا روشن کل مہیا کرنے کا شعور اور نیت رکھتی ھو۔ موجودہ دور کی چیلنجز کو سامنے رکھا جائے تو پھر پیپلز پارٹی سمیت سندھ میں کوئی بھی پارٹی انہیں تقاضوں کو مکمل نہیں کرتی اور تبدیلی کے اس طویل سفر کا ایک ہی حل ہے؛ یعنی مسلسل جدوجہد۔

سندھی زبان کے تحفظ کی جدوجہد

سندھی برصغیر کی قدیم ترین اور موجودہ پاکستان کی مقامی زبانوں میں سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان ہے' سندھی میں 17ویں صدی سے بے شمار کتب تحریر کیے گئے اور ان میں سے کچھ نصاب کا حصہ بھی رہے۔ جب عرب ہندوستان آئے تو سندھی ایک ترقی یافتہ زبان تھی اور متعدد عرب مصنفین نے یہ کہا ہے کہ اس وقت کے دارالحکومت منصورہ میں سندھی عام بول چال میں بہت زیادہ استعمال ہوتی تھی۔ مغل دور میں سندھی نصابی کتب عام استعمال میں تھے۔ 19ویں صدی نے جدید ادب اور صحافت نے سندھی زبان میں ترقی پائی' جب ہندوستان میں ہندی اردو تنازعہ پیدا ہوا تو اس کے حل کیلئے بمبئی حکومت نے 1913ء میں ایک کمیٹی قائم کی۔ کمیٹی نے مسلمانوں کی تشفی کیلئے اردو میں تعلیم کی سفارش کی۔ معروف مسلمان سے رائے حاصل کرنے کیلئے جب یہ رپورٹ ضلعی افسران کو بھیجی گئی تو سندھیوں نے ان سفارشات کی مخالفت کی۔ ریاست خیرپور کے وزیر کا کہنا تھا کہ اس صوبے کی صورتحال یکسر مختلف ہے۔ سندھی زبان مسلمانوں کیلئے بھی اتنی ہی اپنی ہے جتنی سندھ کے ہندوؤں کی۔ ضلعی افسران کی رائے بھی اس سے ملتی جلتی تھی اور سندھی سکولوں میں ذریعہ تعلیم رہی۔ سندھی زبان نے برطانوی راج میں بڑی ترقی پائی۔ سندھ پر 1843ء میں انگریز کے قبضے کے بعد اسے بمبئی کا حصہ بنا دیا گیا۔ صوبے کے گورنر سر جارج کلارک نے سندھ کو صوبے کی سرکاری زبان بنانے کا حکم دیا جس کے بعد سرکاری افسران کیلئے سندھی زبان کا امتحان پاس کرنا لازمی ہوگیا۔ اس وقت کے سندھ کے کشمنر سر بارٹل فریئر نے

29 اگست 1857ء کو باضابطہ حکم جاری کرتے ہوئے سندھ کے افسران کو مشورہ دیا کہ وہ سندھی کا امتحان پاس کریں۔ انہوں نے یہ حکم بھی دیا کہ تمام سرکاری امور کی انجام دہی کیلئے سندھی زبان استعمال کی جائے گی۔ اسی اثنا سندھ میں 7 درجات پر مبنی تعلیمی نظام متعارف کروایا گیا جسے عام طور پر سندھی فائنل کہا جاتا تھا۔ سندھی فائنل میں کامیابی حاصل کرنے والے ریونیو، پولیس اور تعلیم کے محکموں میں نوکری کے اہل ہوتے۔ 1854ء میں سندھی کیلئے عربی رسم الخط اختیار کیا گیا۔ 1848ء اور 1855ء میں انگریزی سندھی لُغات تیار ہوئیں۔ معروف جرمن سکالر ارنیسٹ ٹرمپ نے 1872ء میں سندھی زبان کی گرامر شایع کروائی۔ بمبئی پرائمری ایجوکیشن ایکٹ کے تحت 1938ء میں سندھ میں لازمی تعلیم متعارف کروائی گئی۔ 1954ء تک یہ قانون سندھ کی 53 تحصیلوں میں نافذ کیا جاچکا تھا۔

تقسیم ہند کے ساتھ یہ گنگا الٹی بہنے لگی۔ ہندوستان سے لاکھوں مہاجرین کی آمد اور ساتھ ساتھ یہاں سے سندھی ہندوؤں کی بڑے پیمانے پر سرحد پار نقل مکانی کے باعث چند ہی ماہ میں سندھ کے آبادی کے اعداد و شمار ہی تبدیل ہوگئی۔ سندھی ہندو پڑھے لکھے تھے اور صوبے میں سرکاری ملازمتوں، زراعت اور کاروبار پر حاوی تھے۔ متوسط طبقہ کے انخطاط سے سندھ اپنے معاشرے کے ایک فعال حصے سے محروم ہوگئی اور اس کی جگہ ایسی آبادی نے لی جو ثقافتی سے لحاظ سے اس سے بالکل مختلف تھی اور مذہب کے علاوہ ان میں کوئی یکساں قدر نہ تھی۔ یہ تبدیلی سندھی معاشرہ کی ثقافتی شکست وریخت کا باعث بنی۔ قدیم باسیوں کو ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی جائیدادیں خریدنے سے روک دیا گیا۔ زرخیز زمینیں شہروں میں شاہانہ رہائشی عمارتیں اور پھلتے پھولتی کاروباری مراکز، جھوٹے کلیموں پر مال غنیمت کی طرح پناہگیروں کی جھولی میں ڈال دیے گئے۔ سندھی مسلمانوں کو موثر طریقے سے دیہی، زرعی معاشرہ تک محدود رکھا گیا جس سے ان کی صدیوں پرانی ثقافت اور زبان شاندار ماضی کی یادبن کر رہ گئی۔ سندھ کے تمام شہری مراکز سندھی زبان اور ثقافت سے محروم ہوتے گئے۔ سڑکوں اور گلیوں کے نام تبدیل کر کے انہیں اسلامی بنایا گیا اور سندھی ثقافت کو قابل نفرت ہندو رسوم کی باقیات قرار دیکر ان کی مذمت کی گئی۔ آزادی کے وقت کراچی کی آبادی 4 لاکھ

تھی جس میں 61 فیصد سندھی بولنے والے، جبکہ صرف 6 فیصد اردو بولنے والے تھے۔ 1951ء میں اسی شہر کی آبادی میں اردو بولنے والوں کا تناسب 57 فیصد پر جا پہنچا جبکہ سندھی سکڑ کر 8.6 فیصد رہ گئے۔ تقسیم ہند کے وقت کراچی میں 1300 سندھی میڈیم اسکول تھے جن کو بعد ازاں سندھی زبان کیلئے نوگو ایریا بنا دیا گیا۔ پڑھے لکھے اور شہری مزاج کے مہاجرین کا قدیمی باشندوں سندھیوں نے والہانہ استقبال کیا تھا اور انہی اسلام اور دو قومی نظریہ کے خود ساختہ محافظوں نے ان کو تحقیر کا نشانہ بنایا۔ سندھی ثقافت سے وابستہ ہر چیز کو ہندوؤں کا ورثہ بنا کر پیش کیا گیا۔ سندھی زبان جو مختلف سطح کے تعلیمی اداروں میں ذریعہ تعلیم اور ریونیو اور عدلیہ میں سرکاری خط و کتابت کا ذریعہ تھی، تقسیم کے بعد وہ نو تشکیل شدہ ریاست میں لاوارث بن گئی۔ سندھی زبان اور ثقافت سے روا رکھے گئے اس امتیازی سلوک نے سندھیوں کو برہم کر دیا جو پاکستان کے حق میں قرارداد منظور کرنے والی پہلی قوم تھی۔ سندھیوں کو محسوس ہو رہا تھا کہ ان سے دھوکہ ہوا ہے اور وہ اپنی ہی زمین پر اجنبی بن گئے ہیں کیونکہ نئے ملک سے وابستہ ان کی تمام امنگیں ہولناک خواب بن کر رہ گئی تھیں۔ ترقی پذیر اور آزاد خیال سندھی قوم کو کبھی بھی اردو زبان سے کوئی مسئلہ نہیں رہا تاہم اب پاکستان کی دیگر تمام زبانوں کی شناخت کو پس پشت ڈال کر اردو کو واحد قومی زبان کے طور پر مسلط کیے جانے کے فیصلے نے انہیں جھنجھور کر رکھ دیا۔ مزید برآں ان کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کراچی یونیورسٹی کے سینڈیکیٹ نے 1956ء میں امتحانی زبان سندھی سے تبدیل کر کے اردو کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس غیر دانشمندانہ فیصلے نے تو سندھیوں کے دلوں میں پڑھنے والی دراڑ کو مزید گھرا کر دیا اور اس سے مہاجروں اور قدیمی باشندوں کے درمیان ثقافتی ہم آہنگی کے مبہم تصور کو بھی بڑا نقصان پہنچا۔ احساس برتری کی شکار مہاجر قیادت کے اندر ایسے اقدامات کا ازالہ کرنے کا احساس ہی پیدا نہ ہوا اور ایک نئے ملک کے قومی اتحاد میں شگاف پڑتے گئے۔

وفاقی اکائیوں کی تاریخی شناخت سے انکار کرتے ہوئے ایک مصنوعی قوم کو مجتمع کرنے کی کوششوں میں حکمرانوں نے نہایت ضرر رساں فیصلے کیے۔ بنگال کی سیاسی برتری کو کم کرنے کیلئے ون یونٹ کا قیام بھی ان کی دانش کی منفرد مثال ہے۔ ون یونٹ پاکستان بنانے والی اقوام کی تاریخی شناخت

سے صریح انکار تھا۔ ثقافتی تنوع کا احترام کرتے ہوئے ایک قوم کی تشکیل کے بجائے حکمرانوں نے گاڑی پیچھے گھوڑا جوت دیا اور ایک ایسی قوم جس کا حقیقت میں کوئی وجود ہی نہ تھا کی تشکیل کیلئے بیہودہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ ون یونٹ کے دور میں دیگر صوبوں کی طرح سندھ بھی سرکاری طور پر ختم ہوگیا اور اس کو اس مغربی پاکستان میں شامل کیا گیا جس کا تاریخ میں کوئی وجود ہی نہیں ملتا۔ سندھیوں نے اپنی شناخت کی بحالی کیلئے ایک سیاسی تحریک شروع کی۔ سندھ کی اصل شناخت کی بحالی اور انتخابی فہرستیں اور قومی شناختی کارڈ سندھی میں تیار کرنے کیلئے بھوک ہڑتالیں اور مظاہرے کیے گئے۔ 1956ء کے آئین میں سندھی اور اردو میڈیم طالب علموں کیلئے یہ شق موجود تھی کہ وہ سندھ میں ان دونوں مضامین میں تعلیم حاصل کریں، لیکن بتدریج اردو میڈیم طالب علموں نے سندھی زبان کا مضمون پڑھنا تقریباً ترک کر دیا جس سے صوبے میں ثقافتی ہم آہنگی مزید کمزور ہوگئی۔ کراچی میونسپل کارپوریشن نے اردو کو اپنی سرکاری زبان بنا لیا اور شہر میں لگے تمام سرکاری تختیوں سے سندھی زبان کو ہٹا دیا گیا۔ سندھی اور بلوچ آبادی والے صدیوں پرانے علاقوں کو متواتر کئی برسوں تک ترقی کے عمل سے دور رکھا گیا اور آج بھی یہ علاقے بنیادی سہولیات اور خدمات سے محروم ہیں۔

صدر ایوب نے 50 کی دہائی میں قومی تعلیم کے حوالے سے ایک کمیشن تشکیل دیا جس کو شریف کمیشن کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کمیشن نے چھٹی جماعت سے صرف اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی سفارش کی۔ سندھیوں نے اس کو جبر سمجھتے ہوئے کمیشن کی سفارشات کیخلاف تحریک کا آغاز کر دیا۔ سندھی دانشوروں اور مصنفوں نے 1959ء میں سندھی زبان کے تحفظ کیلئے سندھی لینگوج سوسائٹی قائم کی۔ سوسائٹی کا ایک وفد سندھی زبان کی حیثیت سے متعلق یادداشت پیش کرنے کی خاطر صدر سے ملاقات کیلئے پہنچا لیکن ان کی ملاقات کی درخواست ہی رد کی گئی۔ پاکستان رائٹرز گلڈ نے سندھی زبان سے متعلق تحریک کی حمایت کی۔ ڈھاکہ میں یکم اپریل 1960ء کو ہونے والے اجلاس

میں گلڈ کی لینگوج وسکرپٹ کمیٹی نے سفارش کی کہ ''جیسا کہ سندھی ایک ترقی یافتہ زبان ہے اور گزشتہ 50 برسوں سے یہ ہائی اسکول کی سطح پر ذریعہ تعلیم رہی ہے اس لیے اس کو ثانوی سطح پر ذریعہ تعلیم برقرار رکھا جانا چاہیے''۔

سندھ اسمبلی نے 7 جولائی 1972ء کو سندھی زبان ایکٹ منظور کر کے ایک مثبت قدم اٹھایا' اس قانون کے تحت اردو کو بطور قومی زبان برقرار رکھتے ہوئے سندھی کی سرکاری حیثیت کو بحال کیا گیا۔ ایک مرتبہ پھر مہاجر قیادت دانشمندی کا مظاہرہ کرنے میں ناکام رہی اور اس قانون سازی کو اردو دشمن قرار دیا۔ اردو کے بڑے اخبار جنگ نے جلتی پر تیل کا کام کرتے ہوئے کہا کہ ''اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے''۔ بس پھر کیا تھا! سندھ کے بڑی شہروں میں فسادات پھوٹ پڑے اور سندھی بولنے والوں کو نشانہ بنایا گیا۔ یہ قانون اردو کے خلاف تو نہ تھا' بس اس کے ذریعے سندھی زبان کی وہ حیثیت بحال کی گئی تھی جو اسے قیام پاکستان سے حاصل تھی۔

سندھی' پنجابی' پختون اور بلوچ اپنی زبانوں کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کا مطالبہ کرتے آئے ہیں لیکن ثقافت سے بے بہرہ ملکی حکمرانوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ 2009ء میں سندھ کی معروف ادبی اور ثقافتی تنظیم سندھی ادبی سنگت نے صدر مملکت کو ایک لاکھ پوسٹ کارڈ ارسال کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ پاکستان کی چار بڑی زبانوں سندھی' پنجابی' پشتو اور بلوچی کو قومی زبانوں کا درجہ دیا جائے۔ سندھ لینگوج اتھارٹی نے ایک الگ یادداشت میں حکومت سے یہی مطالبہ دہرایا۔ 2010ء میں چاروں صوبوں کی معروف ادبی تنظیموں اور انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان نے یہی یادداشت پارلیمینٹرین کو پیش کی۔ 2010ء میں سندھ سے تعلق رکھنے والے دو اراکین نے قومی اسمبلی میں دو الگ الگ بل پیش کیے جن میں پاکستان کی اہم زبانوں کو قومی زبان قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ قائمہ کمیٹی برائے قانون نے کسی معقول وجہ کے بغیر ہی ایک بل رد

کردیا۔ سندھی زبان کی حیثیت تسلیم کروانے کیلئے جدوجہد ابھی جاری ہے۔ سندھی عوام نے حکومت سے مایوس ہوکر اپنے طور پر ہی سندھی زبان کے فروغ کیلئے کوششیں تیز کردی ہیں۔ آج کل ایک درجن سے زائد سندھی اخبار شایع ہوتے ہیں جن کی مجموعی اشاعت 10 لاکھ سے زائد ہے۔ نجی شعبہ میں 8 سندھی ٹی وی چینل نشریات پیش کررہے ہیں۔ آئی ٹی کے سندھی ماہرین نے سندھی سافٹ ویئر تیار کرکے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ پر سندھی زبان کے استعمال کو ممکن کردکھایا ہے۔ ہر سال سندھی زبان میں ایک ہزار سے زائد کتب شایع ہوتے ہیں۔ تمام تر مشکلات' مسائل اور روکاٹوں کے باوجود سندھی قوم نے اپنی زبان اور ثقافت کا تحفظ کیا ہے۔

بیسویں ترمیم کا بل اور سندھ کے تحفظات

ایم کیوایم کی جانب سے قومی اسمبلی میں بیسویں آئینی ترمیم کیلئے ایک بل جمع کروایا گیا ہے' اس ترمیم کے تحت آئین میں ریفریڈم کے ذریعے نئے صوبے قائم کرنے کا طریقہ متعارف کرانے کی تجویز دی گئی ہے۔اس بل کے حوالے سے سندھ کے عوام میں متعدد تحفظات نے جنم لیا ہے جو انتہائی اہم ہیں' اس بل کے پس پردہ اصل مقاصد کیا ہیں ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے' اس بل کو غور سے پڑھنے سے درج ذیل نتائج نکالے جاسکتے ہیں۔

1۔ یہ بل آگے چل کر سندھ کی تقسیم کی بنیاد بن سکتا ہے
2۔ یہ بل پاکستان کی سالمیت کیلئے نقصاندہ ہے
3۔ یہ بل اٹھارویں ترمیم کی روح کے برعکس ہے
4۔ یہ بل 23 مارچ 1940ء کی قرارداد کی روح کے برعکس ہے جو پاکستان کے قیام کا بنیاد بنی
5۔ یہ بل 1973ء کے آئین کی خلاف ورزی ہے

مندرجہ بالا تمام پہلوؤں پر بحث کر کے اس کو گہرائی میں سمجھنے کی ضرورت ہے تا کہ اس بل کے بارے میں عملی بنیادوں پر کوئی رائے تشکیل دی جاسکے۔سندھ میں اس بل کو مستقبل میں صوبے کی تقسیم کی بنیاد سمجھنے کے خدشات بے بنیاد نہیں ہیں۔اس بل کے چوتھے پیراگراف میں کہا گیا ہے

کہ ''صوبوں کی حدود مقدس نہیں کیونکہ برصغیر کے اندر ان کی حدود 1526ء سے انتظامی بنیادوں پر عوام کی بہبود کیلئے تبدیل ہوتی رہی ہیں'' یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی نظر میں سندھ سمیت تمام صوبے صرف انتظامی یونٹ ہیں' اس لیے وقت کی حکومتیں جب اور جس طرح چاہیں ان میں تبدیلیاں لاسکتی ہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ پاکستان میں موجود صوبے جو رضا کارانہ طور پر اس میں شامل ہوئے تھے' ان کی ہزاروں سالوں کی تاریخ ہے اور سندھ کے حوالے سے تو سرحدوں کا تقدس اتنا اہم رہا ہے جو تمام تاریخ میں سندھ کے مکین اس کے تحفظ کیلئے برسرپیکار رہے ہیں' اس لحاظ سے سندھ ایک انتظامی یونٹ نہیں بلکہ سندھ واسیوں کا تاریخی وطن ہے۔ یہ بات ان لوگوں کیلئے سمجھنا مشکل ہے جنہوں نے کبھی دھرتی کو وطن بنایا ہی نہ ہو۔ سندھ کے باسی بل پر استعمال کی گئی اس زبان سے یہ نتیجا نکالنے پر مجبور ہیں کہ آج جنوبی پنجاب اور ہزارہ صوبوں کی بات کرنے والے فریق کسی مرحلے پر اس قسم کی آئینی گنجائش کو سندھ کے خلاف بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر ذوالفقار مرزا کے ایک بیان پر اگلے ہی روز دیواروں پر سندھ کی تقسیم کے نعرے لکھوا کر سندھیوں کو یہ دھمکیاں دی جاسکتی ہیں کہ ہمیں دیوار سے لگانے سے قبل نوشتہ دیوار پڑھ لیا جائے تو پھر ان عناصر سے سندھ کے حوالے سے کوئی بھی توقع رکھی جاسکتی ہے۔

یہ بل سرحدوں کو غیر مقدس قرار دیکر درحقیقت پاکستان کے تصور کو بھی مجروح کرتا ہے۔ 1526ء سے صرف انتظامی بنیادوں پر صوبائی سرحدیں ہی نہیں بلکہ ملکی سرحدیں بھی تبدیل ہوئی ہیں' صرف 65 سال پہلے کے ہندوستان میں اب تین ملک موجود ہیں تو کیا اس بنیاد پر یہ کہہ دیا جائے کہ پاکستان کی سرحدیں بھی مقدس نہیں۔ موجودہ صوبوں کی سرحدیں تو ملکی سرحدیں بھی ہیں۔ سندھ اور پنجاب کی سرحدیں پاکستان اور ہندوستان کی سرحد بھی ہیں' اسی طرح پختونخوا کی سرحد پاکستان اور افغانستان کی سرحد ہے جبکہ بلوچستان ایران اور افغانستان سے ملحقہ ملکی سرحد بناتا ہے۔ اس آئینی تعریف کے مطابق یہ تمام سرحدیں بھی غیر مقدس ہیں' آج اگر ریفریڈم کے ذریعے صوبائی سرحدوں کو تبدیل کرنے کا اختیار دیا جاسکتا ہے تو پھر اسی نوعیت کے ریفریڈم کے ذریعے ملکی سرحدیں تبدیل کرنے کے اختیار کا مطالبہ بھی بالکل آئینی ہوگا۔ میرے خیال میں اگر اس قسم کی

کوئی آئینی ترمیم کوئی سندھی یا بلوچ تنظیم پیش کرتی تو اس پر غداری اور ملک دشمنی کے الزامات لگ چکے ہوتے۔ 23 مارچ 1940ء کی قرارداد کے مطابق آزاد ریاستوں میں اس ملک کے ساتھ رضا کارانہ بنیادوں پر الحاق کیا تھا۔ اصولی طور پر برصغیر سے انگریزوں کے جانے کے بعد یہ ریاست اُسی صورت میں بحال ہونا تھی جس صورت میں انگریزیوں نے ان پر قبضہ کیا تھا۔ اسی طرح سندھ اسمبلی کی جانب سے پاکستان کے حق میں منظور کی گئی قرارداد میں بھی سندھ کیلئے لفظ ریاست استعمال ہوا ہے' موجودہ پاکستانی وفاق ان ریاستوں نے مل کر بنایا ہے جن کو صوبے یا انتظامی یونٹ کہا جا رہا ہے' بنیادی طور پر اس لحاظ سے پاکستان ان صوبوں کے باعث وجود میں آیا' صوبے اس کی وجہ سے نہیں تشکیل ہوئے' اس لیے اس وفاق کو یہ حق حاصل ہی نہیں کہ وہ اسے تشکیل دینے والے صوبوں کی حدود میں وہاں کے عوام کی منشاء کے بغیر کوئی تبدیلی کر سکے۔ 23 مارچ کی قرارداد کے مطابق یہ خودمختار ریاستیں تھیں نہ کہ مفتوحہ علاقے جن کے عوام کی رائے لیے بغیر ہی ان کی تاریخی سرحدوں کی تبدیلی کے اعلان اسلام آباد سے کیے جا سکیں۔ 1973ء کے آئین کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ خود آئین کے منافی ہے۔ 1973ء کے آئین کے آرٹیکل 239(4) کو یہاں پر غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔

A bill to amend the constitution which would have the effect of altering the limit of the province shall not be presented to the President for assent unless it has been passed by the provincial assembly of that province by the votes of not less then two third of its total membership.

مذکورہ بالا آئینی شق واضح کرتی ہے کہ آئین میں صرف کسی صوبے کی حدوں میں تبدیلی کا ذکر ہے جس کا مقصد نئے صوبے کا قیام بالکل نہیں۔ دوسری بات کہ یہ شق کہتی ہے کہ کوئی بھی ایسا بل جو کسی صوبے کی حدود سے متعلق ہو اس کیلئے ضروری ہے کہ متعلقہ صوبے کی اسمبلی دو تہائی اکثریت سے اسے منظور کرے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بیسویں ترمیم کا بل صرف پنجاب یا خیبر پختونخوا کی صوبائی اسمبلیوں سے دو تہائی اکثریت کے ساتھ منظوری حاصل ہونے کے بعد ہی آئینی بل

بن سکتا ہے۔ بیسویں ترمیم کا بل اس لحاظ سے صریحاً غیر آئینی ہے کیونکہ کسی بھی صوبائی اسمبلی نے اس کی درکار اکثریت سے منظوری نہیں دی۔ مذکورہ شق میں صوبوں کی حدود میں تبدیلی ہی نہیں بلکہ اس سے متعلقہ کسی بھی بل کے آئینی طور پر متعلقہ صوبائی اسمبلی سے منظوری ضروری ہے اس لحاظ سے یہ بل غیر آئینی طور پر پیش کیا گیا ہے۔

آئین میں تجویز کی گئی یہ ترمیم دراصل اس اٹھارویں ترمیم کے روح کے بھی منافی ہے جس کا صحرا پیپلز پارٹی کی حکومت ہر وقت اپنے سر پر سجاتی رہتی ہے۔ اٹھارویں ترمیم کا بنیادی مقصد وفاق کے اختیار کم کر کے صوبوں کو زیادہ خودمختار بنانا تھا۔ ایک طرف تو اس ترمیم کے ذریعے صوبوں کو بااختیار بنانے کی دعوا کی جاتی ہے تو دوسری طرف مجوزہ بیسویں ترمیم وفاقی حکومت کو یہ اختیار دینا چاہتی ہے کہ وہ ریفریڈم کروا کر صوبوں کی حدود تبدیل کر سکے۔ کسی صوبے کے اختیار میں اس سے بڑی مداخلت اور کیا ہوگی کہ اس کی حدود میں تبدیلی کا اختیار وفاق کے پاس ہو۔ یہ ترمیم ایم کیو ایم کی اس کھوکھلی دعوا کا پردہ بھی چاک کرتی ہے کہ وہ صوبائی خودمختاری کی چیمپئن ہے۔ بیسویں ترمیم کے ذریعے ریفریڈم کی راہ ہموار کرنے والا یہ بل اس لحاظ سے بھی اٹھارویں آئینی ترمیم کے روح کے منافی ہے جس میں یہ دعوا کیا جا رہا ہے کہ اختیار وفاق سے صوبوں کی طرف منتقل کیے گئے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں مذکورہ بل کی حمایت کا کوئی اخلاقی یا اصولی جواز نہیں رہتا لیکن پیپلز پارٹی حکومت اپنی کرسی مضبوط کرنے کے چکروں میں ہمیشہ کی طرح سندھ کے مفادات اور جغرافیائی وحدت کو داؤ پر لگانے کے مترادف قانون سازی کی خاموش حمایت کر رہی ہے۔ اس سے پہلے بھی اتحادیوں کی حمایت برقرار رکھنے کیلئے پی پی پی حکومت سندھ کو دو انتظامی حصوں میں تقسیم کرنے کا خطرناک اقدام اٹھا چکی ہے جس کو سندھ کے مکینوں کے سخت ردعمل کے باعث واپس لینا پڑا۔ پیپلز پارٹی نواز شریف اور اسٹیبلشمنٹ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش میں بیسویں ترمیم کا بل پیش کر کے سندھ کے مفادات کو خطرات سے دوچار کر رہی ہے۔

ایک طرف بیسویں ترمیم کا بل قومی اسمبلی میں پیش ہونے پر پیپلز پارٹی کے اراکین مہر بہ لب ہیں

تو دوسری جانب اس بل کے خلاف صوبائی اسمبلی میں پیش ہونے والی قرارداد کو پی پی حکومت کو روکنے کی کوششوں میں مصروف ہے یہ حقائق واضح کرتے ہیں کہ پیپلز پارٹی براہ راست اس بل کی پشت پناہی کر رہی ہے اور سندھ کیلئے اس کے جو بھی نتائج برآمد ہوں گے ان کی ذمہ داری بھی پیپلز پارٹی پر ہوگی۔

ریفریڈم کے ذریعے صوبائی حدود کی تبدیلی کا اختیار دینا انتہائی خطرناک قدم ہوگا اور اس سے ملک میں ناقابل تصور حد تک انارکی پیدا ہوسکتی ہے۔ ارض وطن میں ضیاء اور مشرف کے ریفریڈم میں کروڑوں لوگوں سے کی گئی اعتماد شکنی کی تاریخ موجود ہے، جس ملک کی ووٹرلسٹوں میں پونے چار کروڑ ووٹ جعلی ہو اور انتخابات کے نتائج کا تعین فرشتے کرتے ہوں وہاں عوامی ریفریڈم کے ذریعے صوبوں کے حدود کے تعین کا اختیار دینا ملک کے مستقبل کو داؤ پر لگانے، اس کے حصے بخرے کرنے اور خانہ جنگی کرانے کی بنیاد بن سکتا ہے، اس بل کے آخر میں نئے صوبے قائم کرنے کے حق میں دی گئی دلیل میں کہا گیا ہے کہ آبادی میں اضافہ، خدمات تک رسائی کے مطالبہ میں شدت آنا، سربراہ، اس کے کابینہ اراکین، بیوروکریسی، قانون نافذ کرنے والے اداروں کی دور افتادہ علاقوں تک رسائی نہ ہونے کے باعث وہاں کے مکینوں کیلئے انصاف کی رسائی ناممکن بن چکی ہے اس لیے نئے صوبے بننے چاہییں۔

یہ دلیل نہایت تعجب خیز ہے کہ گورننس کی خرابی نئے صوبے بننے سے ختم ہوجائیگی اگر یہ دلیل درست ہے تو سب سے پہلے کراچی میں دس بارہ اضلاع بننے چاہییں کیونکہ گڈاپ، ملیر، بن قاسم، لیاری اور کیماڑی کے اکثر علاقے انہیں مسائل سے دوچار ہیں جن کے حل کیلئے کراچی میں بلاتاخیر نئے ضلعے بننے چاہییں۔ علاوہ ازیں اگر صوبے بننے سے یہ تمام مسائل حل ہونے کی ضمانت مل سکتی تو بلوچستان میں یہ تمام مسائل حل ہو چکے ہوتے کیونکہ وہ ایک الگ صوبہ بنا ہوا ہے۔ جن وجوہات کی بناء پر آج گورننس کی صورتحال بگڑی ہوئی ہے وہ مسائل 50 صوبوں کی تشکیل سے بھی حل نہ ہونگے اس لیے سطحی دلیلوں کی بنیاد پر صوبے بنانے کی آڑ میں اپنی سیاسی خواہشیں اور ارادے پورے

کرنے کی اس چالاکی کو سندھ کی عوام کبھی قبول نہیں کرے گی اور اگر پیپلز پارٹی نے اس خطرناک کھیل سے خود کو دور نہ کیا تو سندھ کے باسیوں کیلئے اس سے اپنا رشتہ برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ اب اس کا انحصار پیپلز پارٹی پر ہے کہ وہ اقتدار اور سندھ میں سے کس کا انتخاب کرتی ہے۔

دہرے بلدیاتی نظام کا اور کیا ثبوت چاہیئے

پیپلز پارٹی کی حکومت پورے سندھ کے احتجاج کو پس پشت ڈال کر کہہ رہی ہے کہ نیا متعارف کرایا جانے والا بلدیاتی نظام دوہرا نظام نہیں اور اس کے ناقدین نے یہ دستاویز پڑھا ہی نہیں اس لیے اس پر تنقید بے جا ہے۔ پیپلز پارٹی اور اس کے اتحادیوں کا کہنا ہے کہ جیسا کہ سندھ میں ایک نہیں بلکہ پانچ میٹروپولیٹن کارپوریشنز قائم کی گئی ہیں اور دوسرا کہ میٹروخواہ ضلع کونسل کے چیئرمین کے اختیارات میں کوئی فرق نہیں اس لیے اس نظام کو دہرہ کہنا غلط ہے۔

کسی بھی سیاسی نظام سے متعلق رائے قائم کرنے میں دو باتیں اہم ہوتی ہیں، ایک اس نظام پر عملدرآمد کا طریقہ کار کیا ہے اور دوسرا یہ کہ اس پر عمل کرنے اور کرانے والوں کے سیاسی ماضی کا ریکارڈ کیا ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں نہیں دیکھنی تو پھر کاغذات میں زیادہ تر نظام نہایت خوبصورت، عوام دوست اور قانونی ہوتے ہیں۔ اس لیے سیاسی معاملات کو صرف فنی پہلوں سے جانچ کر پاس یا فیل قرار نہیں دیا جانا چاہیے۔ آج کے دور میں دستاویزات کو غلطیوں سے پاک صاف رکھ کر انہیں عوام دوست شکل دینا کوئی غیر معمولی سائنس نہیں۔ یہ کام ہر شعبہ کے کنسلٹنٹس دو چار لاکھ میں کر کے دے سکتے ہیں۔

بلدیاتی اداروں کے نظام سے متعلق دستاویز صفحہ نمبر 6 پر باب دوئم کی شق نمبر 8 سے دہرے نظام کا

آغاز ہوتا ہے اس شق کے عنوان Corporation Metropolitonof Creation میں کہا گیا ہے کہ حکومت سرکاری گزیٹ میں نوٹیفکیشن کے ذریعے کراچی، حیدرآباد، لاڑکانہ، سکھر اور میرپور خاص کے ڈویژنل ہیڈکوارٹرز کو ایک ضلع پر مشتمل میٹروپولیٹن قرار دے گی۔ اس کے بعد آنے والی پیرا کا عنوان ہے Explanation یعنی وضاحت۔ اس وضاحتی نوٹ میں کہا گیا ہے کہ "یہ واضح کیا جاتا ہے کہ اس آرڈیننس کیلئے ضلع کراچی آرڈیننس کے اجراء سے قبل کہ پانچوں اضلاع پر محیط ہوگا"۔ یہ وضاحتی نوٹ اس نظام میں کراچی کو باقی میٹروپولیٹس کارپوریشنز سے الگ تھلگ کر دیتا ہے یعنی لاڑکانہ، سکھر، میرپور خاص اور حیدرآباد تو ایک ضلع پر مشتمل میٹروپولیٹن ہوں گے تاہم کراچی میں پانچ اضلاع کو ملا کر ایک ضلع بنانے کے بعد میٹروپولیٹن بنایا جائے گا۔

یہ کسی سے پوشیدہ نہیں کہ کراچی کو پانچ اضلاع کے بجائے بلدیاتی نظام کے تحت ایک ضلع بنانے کا مطالبہ کس کا ہے۔ بات بالکل واضح ہے کہ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق حکومتی اتحادیوں کو کراچی کے 5 میں سے صرف 2 اضلاع میں عددی اکثریت ہے۔ اگر کراچی میٹروپولیٹن کو پانچ ڈسٹرکٹ کونسلز بنا کر ایک میٹروپولیٹن قائم کی جاتی تو ان کے ہاتھ پانچ میں سے صرف دو اضلاع کی حکومت لگتی' اگر ان پانچ ضلعی حکومتوں کے نمائندوں پر مشتمل میٹروپولیٹن حکومت کی کونسل تشکیل دی جاتی تو حکومتی اتحادیوں کے میئر کا انتخاب بھی مشکل ہوتا اس لیے بڑی چالاکی کے ساتھ اس آرڈیننس کے ذریعے کراچی کو پانچ اضلاع کے بجائے 18 ٹاؤنز کی کارپوریشن بنا کر اتحادی جماعت کی شہری حکومت کیلئے راستہ صاف کیا گیا۔ اس طرح کراچی میٹروپولیٹن کو دیگر میٹروپولیٹنز سے علیحدہ کیا گیا اس لیے یہ نظام بلاشبہ دہرا نظام ہے۔ بلدیاتی اداروں سے متعلق 2012ء کے نظام کیلئے جاری کیے گئے دستاویز میں مندرجہ ذیل نکات غور طلب ہیں:

دستاویز کے باب دوئم کی شق 6بی میں لکھا گیا ہے کہ یونین کونسل کی حدود کسی میٹروپولیٹن کے اندر کسی تحصیل یا ٹان کی حدود سے باہر نہیں نکلیں گی۔ بات تو معقول ہے' کیونکہ ایسا کرنے سے ریونیو کی اکائی اور انتظامی اکائی یکساں رہے گی' تاہم یہ شرط کسی ٹان کے حدود پر لاگو نہیں کی گئی کہ وہ کسی

ضلعی کی جاگرافائی حدود سے باہر نہیں نکلے گا۔ اگر یہی شرط ٹاون پر لاگو کیا جائے تو اس سے کراچی کا محل وقوع ایک دم بدل جائے گا۔ اس وقت کراچی میں پانچ اضلاع اور اٹھارہ ٹاون ہیں' اس میں ٹاون کی حدود ضلع کی ریونیو حدود کی پابند نہیں' بعض ٹاون ایک سے زائد اضلاع میں پھیلے ہوئے ہیں یعنی ان کا کچھ حصہ ایک ضلع میں تو کچھ حصہ دوسرے ضلع میں ہے۔ یہ مشرف دور میں اس لیے کروایا گیا کہ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق اس وقت کے چار اضلاع میں حکومت کی اتحادی جماعت کی اکثریت محض سینٹرل اور مشرقی اضلاع میں تھی اور باقی تین اضلاع میں ان کی حکومت بننے کا کوئی امکان نہ تھا۔ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع شرقی میں اردو بولنے والوں کی آبادی 40 فیصد' جنوبی میں 26 فیصد اور ملیر میں صرف 16 فیصد تھی اس لیے ان علاقوں میں ایم کیو ایم کی ضلعی حکومت بننا ممکن نہ تھی۔ مشرف دور میں ٹاون اس طرح تشکیل دیئے گئے کہ ان میں آبادی کا توازن ان کے حق میں چلا گیا اور وہ اکثریتی ٹاون مالک بن گئے۔ اصولی طور پر اگر یہ نظام یونین کونسل کے ایک تحصیل کے اندر ہونے کی شرط عائد کرتا ہے تو اسے ٹاون کی حدود کیلئے بھی وہی شرائط عائد کرنی چاہیئے۔ اگر کراچی کو میٹروپولیٹن شہر قرار دے کر اس کے ٹاون اضلاع کے حدود کے اندر رکھیں جائیں تو ٹاون کی حکومتیں اس طرح اتحادی جماعت کے پاس نہیں رہیں گی۔ جب اکثریتی ٹاونز کی حکومتیں ان کے پاس نہیں ہوں گے تو وہ اپنا میئر بھی نہیں چنوا سکیں گے۔ یہ نقطہ بھی کراچی کو باقی سندھ سے الگ کرتا ہے۔ مشرف دور میں ناظمین کی جانب سے اختیارات کے غلط استعمال نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ضلعی حکومتوں کے پاس شہری امور کے میونسپل نوعیت کے انتظامی اختیار ہونا تو ٹھیک تاہم انہیں مجسٹریٹ کے اختیارات دینے کے نتائج سنگین نکل سکے ہیں۔ خاص طور پر کراچی جہاں لسانی بنیادوں پر تقسیم اور مختلف آبادیوں میں تصادم کی تاریخ سالوں نہیں بلکہ عشروں پر محیط ہے وہاں کسی ایک فریق کو شہر میں پولیس سے متعلق اہم اختیارات دینا کس قدر خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

آرڈیننس کے پہلے شیڈول میں ضلع اور میٹروپولیٹن حکومتوں کو منتقل کیے گئے اختیارات کی فہرست موجود ہے' 22ویں نمبر اختیارات کے تحت میئر اور ضلع چیئرمین کو اپنے حدود میں ناجائز تجاوزات

ہٹانے اور امن وامان قائم کرنے کیلئے ضابطہ فوجداری کے تحت سیکشن 144,143,133,109 اور 145 کے اختیارات اور پولیس ایکٹ 1861ء کے تحت سیکشن اے 30 سے بی 34 کے اختیار تفویض کیے گئے ہیں۔ یہ اختیارات ضلع اور میٹروپولیٹن حکومتیں اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف استعمال کرسکتی ہیں۔ پولیس کے سیاسی استعمال کی تاریخ اس ملک میں بہت قدیم ہے' جب دفعہ 144 جیسے اختیارات میئر یا چیئرمین کے حوالے ہوں گے تو وہ مقامی سیاست کو بزور بازو اپنے تابع بنانے کی کوشش کریں گے۔ کراچی میں جہاں مختلف آبادیوں میں شدید تصادم ہے وہاں شہری حکومت حاصل کرنے والی جماعت باقی فریقین کے خلاف ان اختیارات کا کھل کر استعمال کرے گی۔ وہ مخالفین کو شہر میں کوئی جلسہ نہیں کرنے دیں گے' تجاوزات ہٹانے کا قانون کراچی سے باہر تو سبزی اور فروٹ کے ریڑھے ہٹانے کے کام آئے گا بلکہ کراچی میں یہ اختیار سندھیوں اور بلوچوں کی بستیوں کو بلڈوز کرنے کے کام آئے گا' ماضی میں ایسی کئی مثالیں نظر آئیں جب سندھیوں اور بلوچوں کی صدیوں پرانی بستیوں پر بلڈوزر چلا دیئے گئے۔ وہ فریقین جو اسلحہ کے زور پر سیاست کرتے ہیں ان کو سرکاری مشینری پر اس طرح کے اختیارات دینے کا مقصد بلاواسطہ طور پر انہیں کراچی سے سندھیوں اور بلوچوں کو بیدخل کرنے کے اختیار دینا ہے۔

ضلع اور میٹروپولیٹن کارپوریشنز کو اختیارات کی منتقلی کے حوالے سے ایک اور شق بھی نہایت اہم ہے۔ باب دوئم کی شق نمبر 5 میں کہا گیا ہے کہ' کونسلیں اپنے وسائل سے کوئی بھی محکمہ قائم کرنے یا کوئی اور سرگرمی کرنے کیلئے بااختیار ہوں گی۔ اس اختیار کو سیاسی مفادات کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یاد رہے کہ جب اپنے وسائل سے محکمہ قائم کرنے کی بات کی جاتی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ سندھ میں اضافی وسائل تو صرف کراچی یا حیدرآباد کے شہروں میں ہی پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ آبادی والے شہر کراچی میں اگر دو چار چھوٹی رقم کے محاصل بھی متعارف کروائے جاتے ہیں تو ان کی سالانہ آمدن کروڑوں میں ہوگی۔ سکھر' میرپور خاص اور لاڑکانہ میں نہ تو صنعت ہے اور نہ شہری املاک کہ اربوں روپے کے سودے ہوتے ہیں' نہ بیرونی کمپنیوں یا کارپوریشنوں کے دفاتر ہیں' نہ ٹریفک خلاف ورزیوں کے چالانوں سے بڑی آمدنی اور نہ ہی آمدنی کے دیگر ذرائع ہیں۔

اس لیے ان کے پاس مرضی سے نئے محکمے قائم کرنے کیلئے اپنے وسائل تو کبھی جمع نہیں ہوں گے تاہم کل اگر کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن اپنے وسائل جمع کر کے یہ کہے کہ شہر میں سٹریٹ کرائم کی روک تھام کیلئے مقامی فورس تشکیل دینا چاہتے ہیں اور اس میں حکمران جماعت اپنی تنظیم کے دس ہزار کے لگ بھگ لوگ بھرتی کر دی تو پھر انہیں سرکاری تنخواہ پر سیاسی مخالفین کے خلاف آرام سے استعمال کیا جا سکے گا۔ یہی کچھ گزشتہ سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کراچی میں کیا گیا تھا جب سٹی پولیس کے نام پر حکمران جماعت نے اپنے پانچ 6 ہزار لوگ بھرتی کر لیے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اس جماعت کے وفادار کارکن تھے۔ نئے محکمے بنانے اور سرگرمی کے ایسے اختیارات کا کتنا غلط استعمال ہو سکتا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ بلاواسطہ طور پر یہ مراعات بھی کراچی کو دیکر نظام کو دہرا بنایا گیا۔

اس بلدیاتی نظام میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر کو عملی طور پر ناکارہ بناتے ہوئے اس کا کوآرڈینیشن کا کردار بھی ختم کیا گیا ہے' پی پی کے 2008ء کے انتخابی منشور میں واضح طور پر لکھا ہے کہ کوآرڈینیشن کا کردار ڈی سی او کے پاس ہوگا تاہم اس آرڈیننس کے تحت چیف آفیسر کا عہدہ تخلیق کر کے یہ اختیارات اسے تفویض کیے گئے ہیں۔ چیف آفیسر براہ راست ضلعی یا میٹروپولیٹن حکومت کو جوابدہ ہوگا اس لیے بلدیاتی حکومتیں عملی طور پر صوبائی کنٹرول سے مکمل آزاد ہوں گی اور آزادی سے اپنی منشا کے مطابق فیصلہ کر سکیں گی۔ مثلاً کراچی میں کس بستی کو منہدم کرنا ہے یا کس سیلاب متاثر کو کیمپ لگانے دی جائے یا نہ دی جائے جیسے فیصلے چیف آفیسر کے ذریعے ہوں گے اور صوبائی حکومت آبادی کے کسی بھی حصے کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کو روکنے کے قابل نہیں رہے گی۔ ڈپٹی کمشنر کے پاس صرف ریونیو کے امور رہ جائیں گے تاہم اس معاملے میں بھی کراچی کی صورتحال مختلف ہوگی۔

آرڈیننس کے ساتویں باب میں صوبائی مالیاتی کمیشن کا ذکر ہے۔ اس بابت کہا گیا ہے کہ یہ کمیشن مختلف اضلاع اور میٹروپولیٹن کارپوریشنز کی مالی گرانٹ کے حوالے سے وزیراعلیٰ کو سفارشات

دے گی۔ شق 126 (2) میں کہا گیا ہے کہ گرانٹ کے تعین سے متعلق ان سفارشات کی بنیاد مالی ضرورتوں' مالیاتی صلاحیت' مالیاتی کوششوں اور کارکردگی پر ہوگی۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام عوامل کراچی اور حیدرآباد کی میٹروپولیٹن کارپوریشنز کو فائدہ دیں گے۔ کراچی میں دو بڑی بندرگاہیں' ایک بڑا ہوائی اڈا' سینکڑوں کارپوریشنز' بنک' انشورنس کمپنیاں' صنعتی علاقے' درآمد و برآمد کے کاروبار موجود ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ آبادی کی معاشی سرگرمیوں کے مرکز کے طور پر اس شہر کی مالیاتی امور میں صلاحیت' کارکردگی یا ضروریات لازماً دیگر شہروں اور اضلاع سے زیادہ ہوں گی۔ اس لیے مالیاتی کمیشن بڑے آرام سے صوبوں سے منتقل ہونے والی گرانٹس کا بڑا حصہ کراچی اور اس کے بعد حیدرآباد کیلئے وقف کرے گا۔ باقی رہے گا سندھ کے بدحال اضلاع جن کو میٹروپولیٹن کارپوریشن کا نام دینا بالکل ایسے ہی جیسے کسی بھی لنک روڈ کو موٹروے قرار دے دیا جائے' وہ کس بنیاد پر بڑی گرانٹس حاصل کرسکیں گے۔ مثال کے طور پر اگر مالیاتی کارکردگی کے پہلو کو دیکھا جائے تو کراچی سے کسی اور ضلع کونسل تو کیا میٹروپولیٹن کارپوریشن کا بھی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ سندھ بیورو آف اسٹیٹسٹکس کی 2008ء کی رپورٹ (اس کے بعد جاری کردہ کوئی تازہ رپورٹ دستیاب نہیں) کے مطابق 2006-07ء میں صوبائی ایکسائیز ڈیوٹی اور ٹیکسز کی مد میں کراچی کی آمدن 90 لاکھ روپے تھی جبکہ اس کے مقابلے میں دیگر اضلاع جیسے حیدرآباد کی آمدن 3 لاکھ 41 ہزار' سکھر ایک لاکھ 42 ہزار' لاڑکانہ 76 ہزار اور میرپورخاص میں 89 ہزار کی وصولی ہوئی۔ اس تناسب سے گرانٹس کی تقسیم میں کراچی کے سوا باقی اضلاع کو کیا ملے گا۔ یہ امر بھی باعث حیرت ہے کہ قومی مالیاتی ایوارڈ میں غربت اور پسماندگی کو شامل کیا گیا تاہم صوبائی ایوارڈ میں ان کا حوالہ بھی نہیں دیا گیا۔ گرانٹ کی بنیاد میں غربت' معاشرتی پسماندگی' انسانی ترقی کی حالت اور ترقی کی ضرورت جیسے اشاریوں کو شامل نہ کرکے میدان صاف کیا گیا ہے کہ آمدنی کا بڑا حصہ محض کراچی اور حیدرآباد کیلئے وقف ہوسکے۔ حکومت اور اتحادیوں کا دعویٰ ہے کہ میٹروپولیٹن کارپوریشنز اور ضلعی حکومت کو یکساں اختیارات دیئے گئے ہیں اس لیے نئے نظام کو دہرا نظام کہنا غلط ہے۔ اس دلیل کے حق میں باب سوئم کی شق نمبر 18 کا حوالہ دیا جاتا ہے جس میں میئر اور چیئرمین کے فرائض اور اختیارات کو مساوی قرار دیا گیا ہے۔ تاہم شیڈول اول میں نیچے منتقل کیے گئے تین محکمے ایسے ہیں

جو صرف میٹروپولیٹس کارپوریشنز کے حوالے کیے گئے ہیں۔ ان میں محکمہ نمبر 3 ان لینڈ فشریز، محکمہ نمبر 7 پرائمری تعلیم اور محکمہ نمبر 15 کے ایم سی اور کے ڈی اے کی اراضی شامل ہیں۔ ماہی گیری کو میٹروپولیٹن کارپوریشن کے حوالے کرنے کی منطق ناقابل فہم ہے۔ اس محکمہ کو بھی کراچی میں الگ حیثیت حاصل ہو جائے گی کیونکہ اس سے سندھ اور بلوچ آبادیوں کی صوبائی حدود میں ہونے والی ماہی گیری براہ راست شہری حکومت کے کنٹرول میں آجائے گی اور اس سے کراچی فش ہاربر اور کورنگی ہاربر یہاں تک کے ابراہیم حیدری اور ریڑھی کی ماہیگیری جیٹیوں اور فشرمین کوآپریٹو سوسائٹی پر کنٹرول کی راہ ہموار ہوگی۔ ویسے بھی فشرمین کوآپریٹو کوآپریشنز سے متعلق شعبے کے تحت ہے اور یہ محکمہ میٹروپولیٹنس کے حوالے کیا گیا ہے اس لیے یہ اہم ادارہ بھی کراچی میں میئر کی مرضی کے مطابق چلے گا۔ اسی طرح کوآپریٹو ڈپارٹمنٹ کے تحت ہاوسنگ کوآپریٹوز بھی رجسٹرڈ ہوتی ہیں۔ کراچی اور حیدرآباد میں اگر میئر چاہے گا تو آرام سے سندھی، بلوچ یا دیگر قوموں کی بستیوں میں ہاوسنگ کوآپریٹوز کی اجازت نہ دیکر بلاواسطہ طور پر کراچی میں ان کی آمد کو طاقت کے ساتھ روک سکے گا، اس مقصد کیلئے ہاوسنگ زوننگ، لینڈ کلاسیفکیشن کے اختیارات بھی استعمال کیے جائیں گے۔ جیسا کہ دیگر میٹروپولیٹنس میں صورتحال ایسی نہیں اس لیے کراچی اس حوالے سے بالکل الگ ہوگا۔

اس آرڈیننس کے تحت پرائمری تعلیم میٹروپولیٹن کارپوریشنز کے حوالے کرنے نتیجے بھی اسی نوعیت کے نکلے گے۔ میٹروپولیٹن حکومتیں کراچی اور حیدرآباد میں جب چاہیں سندھی میڈیم سکول جو پہلے ہی آٹے میں نمک برابر ہے ان کو بند کرادیں گی۔ اساتذہ کی بھرتیوں اور نئے سکول کھولنے سمیت دیگر امور میں امتیازی طرز عمل کے خدشات موجود ہیں۔ یاد رہے کہ پیپلز پارٹی نے 2008ء کے انتخابی منشور میں وعدہ کیا تھا کہ پرائمری تعلیم بلدیاتی اداروں کو منتقل کی جائے گی تاہم اس کے برعکس یہ محکمہ صرف میٹروپولیٹن کارپوریشنز کو دیا گیا ہے جبکہ باقی سندھ میں یہ محکمہ ضلعی حکومت کی جانب منتقل نہیں کیا گیا۔ اسی طرح کے ڈی اے اور کے ایم سی کی اراضی کو ایک الگ محکمہ بنا کر میونسپل کارپوریشن کے حوالے کرنے کا مقصد صرف کراچی کی بات کرنی ہے کیونکہ میٹروپولیٹن قرار

دیئے گئے کسی اور شہر میں یہ محکمے موجود ہی نہیں۔ ان دو محکموں کی زمینیں اور ڈویلپمنٹ اتھارٹیز کے اختیارات بھی کراچی میں ایک سیاسی جماعت کے حوالے ہو جائیں گے اس لیے وہاں باقی آبادیوں کے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا اس کا اندازہ ہر کوئی لگا سکتا ہے۔

سندھ میں دہرے نظام کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ مشرف دور کا پولیس آرڈر صرف کراچی میں نافذ کیا گیا ہے' پولیس آرڈر 2002ء کو صرف کراچی میں بحال کر کے 20 ڈویژنز بنائی گئی ہیں جن کی سربراہی 15 ایس پیز اور 5 ایس ایس پی کریں گے جبکہ باقی تمام سندھ میں 1861ء کا پولیس ایکٹ لاگو رہے گا جہاں تفتیش اور آپریشن کے شعبے اسی طرح اکٹھے ہوں گے۔ کیا اب بھی حکومت یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس نے سندھ میں دہرا نظام رائج نہیں کیا؟ پیپلز پارٹی آئندہ حکومت بنانے کیلئے اپنے اتحادیوں کی خوشی کی خاطر انتہائی نقصان دہ سیاسی فیصلے مسلط کر کے سندھ میں لسانی تفریق کو بڑھا کر نا قابل تلافی نقصان کر رہی ہے جس کے آنے والے برسوں میں سندھ پر نہایت منفی سیاسی اثرات مرتب ہوں گے۔

نچلے درجے کے شہریوں کے لیے قانون

صدر پاکستان نے حال ہی میں دو حکمناموں اینٹی ٹیررازم [ترمیم شدہ] ایکٹ 2013ء اور پروٹیکشن آف پاکستان آرڈیننس-پی۔پی۔او 2013ء کا اجراء کیا ہے۔سرکاری دستاویز پی۔او، قانون کی حیثیت سے اجازت دیتا ہے کہ "پاکستان کے خلاف جنگ میں مدد کرنے والوں کے مقابلے میں تحفظ کی فراہمی اور ایسے اقدامات سے بچاو مہیا کرنا جو کہ پاکستان کے سیکیورٹی معاملات کے لیے خطرہ ہوں۔"

یہ دونوں قوانین، ملک میں دہشتگردی کی روک تھام کے لیے بے رحمانہ طریقوں کا اجراء کرتے ہیں۔قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اس طرح غیر معمولی طاقت کا منبع بنا کر دہشتگردی کو ہر طریقے سے کچلنے کا جواز مہیا کیا گیا ہے۔ان دونوں قوانین کا بغور جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ظالمانہ قانون انسانیت سے عاری ہیں۔

کچھ شقیں نوآبادیاتی دور کے قانونی ہتھکنڈوں کی یاد تازہ کرتی ہیں جن سے لوگوں کو دبا کر رکھا جاتا تھا۔یہ قانون، ریاست کے عالمی یقین دہانیوں جیسا کہ عالمی معاہدے شہری و سیاسی حقوق اور بین الاقوامی قرارداد برائے انسانی حقوق کی بھی خلاف ورزی ہیں۔ایسا ملک جو کہ جمہوری راہ پر گامزن ہے، اس کے لیے یہ لازمی ہے کہ انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے مناسب تحفظ فراہم کرے۔

انسانی حقوق کے تناظر میں پہلے ہی ملک کے کردار پر سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ ایسے حالات میں ملک اس طرح کے قانونی شکنجے مزید برداشت نہیں کرسکتا۔ پروٹیکشن آف پاکستان آرڈیننس کہتا ہے کہ "جس عمل سے قتل، بڑا صدمہ، جائداد کو نقصان ثابت ہو، کسی بھی آفیسر کے لیے معقول اسباب کے بعد یہ قانون کہ مطابق ہوگا کہ وہ ایسے کسی بھی شخص یا اشخاص کے اوپر فائر یا فائرنگ کا حکم دے جن کے خلاف اس کو اجازت دی گئی ہے۔ ان کے خلاف یہاں دی گئی شرائط کے مطابق طاقت کا استعمال کرے۔" اسی طرح سے، قانون نافذ کرنے والے اداروں کے لوگ کسی بھی چاردیواری یا آدمی کی گرفتاری کے سلسلے میں سرچ وارنٹ کی ضرورت سے مبرا قرار دیے گئے ہیں۔ پروٹیکشن آف پاکستان آرڈیننس، پولیس، سول اور آرمڈ فورسز کو اختیار دیتا ہے کہ ایسے افراد کو قید اور تعاقب کریں جن کی شناخت مشکوک اور اجنبی دشمن کے طور پر ہو اور ظاہراً وہ پاکستان کے خلاف جنگ یا بغاوت کررہے ہوں۔

پروٹیکشن آف پاکستان آرڈیننس کے سیکشن ۴۱ میں طے شدہ شقوں کو مزید مجرمانہ شکل دی گئی ہے۔ اور اس کا سارا ملبہ مجرم پر ڈالا گیا ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف جنگ یا غداری سے قطع تعلق کرے۔ سیکشن ۵[۵] کے اندر، بشمول ان کے جن کی شناخت اجنبی ہو انہیں ۹ دنوں کی حفاظتی تحو?ل میں لینے کا اختیار بھی دیا گیا ہے۔

یہ سیکشن قانون نافذ کرنے والے اداروں کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے لیے شرمناک قانونی جواز فراہم کرتے ہیں۔ سپریم کورٹ آف پاکستان نے بھی بڑی شفافیت سے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو جبری گمشدگیوں اور لاشوں کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ ایسا آزاد اور خودمختار ادارہ جو انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر نظر رکھے اس کی غیر موجودگی میں ان تحفظات کو مزید تقویت ملتی ہے۔ اور یہ سب ایسے وقت میں جب کہ سلے ہوئے لبوں والی انسانی حقوق کی وزارت بھی قانون اور انصاف کی وزارت میں ضم ہوکر اپنی چمک دمک کھو چکی ہے۔

ان خیالات میں اب کوئی ابہام نہیں رہا کہ دہشتگردی کو ختم کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح، اس اہم

ہدف کی تکمیل کے لیے ریاست کو چاہیے کہ وہ دہشتگردی کے طریقوں کے مکمل خاتمے کے لیے اپنے عزم کا کھل کر اظہار کرے۔ جیسا کہ دہشتگردی کو بری اور اچھی دہشتگردی میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ دہشتگرد گروپوں کے لیے رسمی جھکاو نے شہریوں اور عالمی برادری کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔

حکومت ان طاقتوں کے ساتھ گفت وشنود کے درپے ہے جنہوں نے دہشتگردی کو جہاد کے لبادے میں پہنا ہوا تھا۔ گذشتہ دہائی سے ان گروہوں نے خوف اور دہشت کا ایسا راج قائم کیا ہوا ہے جس نے معاشرے اور حکومتی اداروں دونوں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ وہ عوام کے سامنے سینیئر فوجی آفیسروں کے اغوا اور قتل، مذہبی اور مسلکی اقلیتوں پر حملوں اور معصوم شہریوں کے بہیمانہ قتل کی خطرناک کارروایوں کے دعوی کرتی رہیں ہیں۔ ان قوانین کا اجراء ایسے وقت میں کیا گیا ہے جب ان گروہوں کے ساتھ گفت وشنید کا سلسلہ ہائے شوق بھی جاری وساری ہے۔ تو یہ سوال نہایت معقول اور برمحل ہے کہ ان قوانین کو کہاں استعمال میں لایا جائے گا؟

یہ ایک سنجیدہ خیال ہے کہ دہشتگردی کی موجودہ یلغار ۹/۱۱ کے سانحے کیبعد پیدا ہوئی۔ درحقیقت، یہ واقعہ دہائیوں سے دہشتگردی کی پشت پناہی کا بویا ہوا کڑوا پھل تھا۔ عالمی طاقتوں نے کمیونزم کو شکست دینے کے لیے اس ملک میں مذہبی قوتوں کو فروغ دیا۔ شکست سے دوچار اور سیاسی بلوغت سے عاری پاکستان کی خارجہ پالیسی نے کبھی بھی ایسا فروغ نہیں پایا جس سے شہریوں کے جائز مفادات کا تحفظ ممکن ہو۔ عشروں سے مذہبی شدت پسندی کے خطرناک نتائج سے بےخبر رہ کر اسے خارجہ پالیسی کا لازمی جز بنایا گیا۔

پاکستان آغاز سے ہی سیکیورٹی ریاست کی طرز پر آگے بڑھا۔ مذہبی جذبوں کو کمال فن سے پائمال کرتے ہوئے خارجہ پالیسی کو عقیدے کی آگ میں جلایا گیا۔ جس نے ایوب اور بھٹو کو مذہبی عناصر کے سامنے گھٹنے ٹیکنے اور ان کے غلبے کو ریاست کے معاملات میں دخل اندازی دینے کے متواتر

مواقع فراہم کیے۔ 80 دہائی کا افغان جہاد مذہبیت کو اداروں کی سرپرستی مہیا کرتے ہوئے سرکاری چھتری کے سائے تلے پاکستانی معاشرے کا جزو لازمی بن گیا۔

اس نظریہ کو اتنا فروغ دیا گیا کہ اب مذہب کے عمل دخل کو حکومتی اور معاشرتی معاملات میں روکنا ناممکن سا لگتا ہے۔ افسوس کہ، یہ مذہبی جذبہ کسی روحانی یا سرکردہ سماجی حیثیت کی نمائندگی نہیں کرتا۔ بلکہ یہ ایک جارحانہ خبط ہے جو کہ اسلام کے فروغ کے لیے دنیا کو فتح کرنا چاہتا ہے۔ دہائیوں سے جارحیت اور تشدد کے فروغ نے جہاد کو حکومتی اور غیر ریاستی عناصر کا مرغوب مشغلہ بنایا ہوا ہے۔

یہ ہی سبب ہے کہ، تشدد اور دہشتگردی کے اعمال کو مقدس جنگوں سے مماثلت دی جاتی ہے۔ اگرچہ حکومتی مشینری کے ایک گروہ نے سرتوڑ کوشش کی کہ حکومت کے پرورش کیے گئے اس بے لگام گھوڑے کو قابو کیا جائے مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ یہ عوامل مذہبی عناصر کے بارے میں سرکاری صفوں میں پائی جانے والی گہری خلیج کو ثابت کرتے ہیں۔ جب غیر معروف دہشتگردوں کی بھی انتہائی ذمہ وار عملداروں کی عوامی تقریروں میں پشت پناہی کی جاتی ہے۔

شہریوں اور سول سوسائٹی کو، اس طرح کی خراب صورتحال اور اس طرح کے قانون سے پیدا ہونے والے استحصال سے سنجیدہ تحفظات ہیں۔ شہری حقوق کے کارکنان خاص طور پر بلوچستان اور سندھ میں ان قوانین کی تشہیر کو سیاسی اور شہری حقوق کے نمایاں ابھار کو کچلنے کا ھتکنڈا سمجھتے ہیں۔ جبری گمشدگیوں، متعلقہ مغویوں پر تشدد اور ان کی مسخ شدہ لاشوں کا سلسلہ بلوچستان میں ایک معمول بن چکا ہے۔ کچھ مہینوں سے سندھ بھی اسی لہر کا شکار ہوا ہے جس میں اسی ہی طریقے کار کو دہرایا گیا ہے۔

قومی جماعتوں اور سول سوسائٹی کے متحرک لوگ ان دونوں صوبوں میں شدت سے ایسی قانون

سازی کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ان حالات میں انسانی حقوق کے لیے متحرک افراد اپنے تحفظات کا اظہار کر رہے ہیں کہ اگر حکومت دہشتگرد تنظیموں کے سامنے گھٹنے ٹیکتی رہی ہے تو پھر ان قوانین کا نشانہ کون بنے گا؟ خراب ساکھ رکھنے والا ملک انسانی حقوق کے خلاف مسلسل شدید بے ضابطگیوں کا مظہر بنا ہوا ہو۔ اس کے لیے ایسے اقدام کو عالمی برادری اور سول سوسائٹی کے سامنے وضاحت دینا مشکل ہوگا۔ اگر حکومت اور سیکیورٹی ادارے دہشتگردوں کے ٹھکانوں کا صحیح طور پر خاتمہ کرنا چاہتے ہیں تو سیاسی استحکام کا نظریہ ایک مظبوط ارادے اور مدلل دلیل کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس معاملے میں اندرونی اور بیرونی معاملات کی بہتر نگرانی ضروری ہے۔

ایسے زہریلے قوانین کا اجراء موجودہ مسائل کو مزید ہوا دے گا۔ ریاست کو شہریوں کے لیے اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرنا پڑے گی اور اپنی ترجیحات کا پھر سے تعین کرنا پڑے گا۔ وفاقی اکائیوں کے تاریخی حقوق کا احترام اور ملک میں جمہوری اقدار کو روشناس کرائے بغیر امن کا خواب نہیں دیکھا جا سکتا۔ ایک مکمل جمہوری تشکیل نو ہی مستحکم حل کا موجب بن کر ملک کو دہشت گردی سے نجات دلا سکتی ہے۔ ایک مستحکم اور جوابدہ پارلیمنٹ، آگاہی سے روشناس شہری اور متحرک سول سوسائٹی اپنی وسیع شمولیت سے دہشتگردی کے مسئلے کو حل کر سکتی ہے۔ نچلے درجے کے شہریوں کے لیے قانون بنانے کے بجائے ان کو مستحکم کرنے کا عمل بہتر نتائج دے سکتا ہے۔

10 نومبر 2013ء

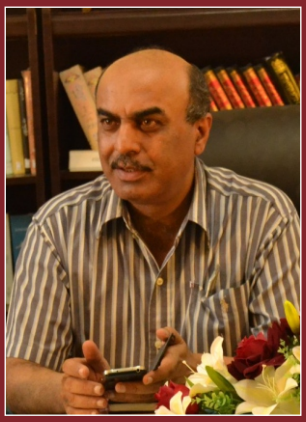

Naseer Memon is a development professional and writers. He regularly writes in Sindhi and English newspapers and magazines inter alia Kawish, The News, Dawn and The Express Tribune. He has authored 10 books/discussion papers in Sindhi, 7 in English and 3 in Urdu. He mainly writes on the issues pertaining to governance, democracy, federalism, human rights and environment. He speaks on various national and international forums and represents on high profile national and international bodies.

Center for Peace & Civil Society
127, Sindhi Muslim Housing Society,
Qasimabad, Hyderabad, Sindh, Pakistan.
Ph: +92-22-2652401, Fax: +92-22-2652401
info@cpcs.org.pk_ _www.cpcs.org.pk